ادبی نمونے

حصۂ نثر

امیر حسن نورانی

مرتضیٰ حسین موسوی

انوار الحسن صدیقی

ناشر

انوار بک ڈپو امین آباد۔ لکھنؤ

ادبی نمونے

(حصۂ نثر)

ہائی اسکول کی نویں اور دسویں جماعتوں کا نصاب

مؤلفہ و مرتبہ

سید امیر حسن نورانی
استاذ ادبیات
امیر الدولہ اسلامیہ کالج لکھنؤ

سید مرتضیٰ حسین موسوی ایم اے
وائس پرنسپل
امیر الدولہ اسلامیہ کالج لکھنؤ

و

انوار الحسن ص[illegible]
معلم اسلامیہ کالج

ناشر

انوار بک ڈپو، امین آباد پارک لکھنؤ

سنہ ۱۹۵۱ء

مطبوعہ سرفراز قومی پریس لکھنؤ

قیمت ۱۲/

نگاہِ اوّلین

پیشِ نظر انتخاب ہائی اسکول کے طلبار کی ذہنی اور ادبی صلاحیتوں کو سامنے رکھ کر ایک خاص معیار کے مطابق مرتّب کیا گیا ہے۔ اس وقت طلبا اپنی عمر اور استعداد کے ایسے دور میں قدم رکھتے ہیں جب ان کو صحیح ادبی مذاق سے ایک گونہ تعلق پیدا ہو جاتا ہے۔ اس منزل میں اگر اُن کو مناسب رہنمائی مل گئی تو یقیناً ادبی دنیا میں ان کا مستقبل شاندار ہوگا۔

ہائی اسکول کے طلبار کے لیے گذشتہ اور موجودہ دَور کے معیاری اہل قلم کے اچھے اچھے مضامین منتخب کیے جاتے ہیں تاکہ وہ ہر دَور کے اچھے لکھنے والوں کے طرز و اسلوب سے واقف ہو سکیں۔ اس سلسلہ میں جتنے انتخابات آپ کو ملیں گے وہ سب چند گنے ہوئے ادیبوں کی کتابوں سے ماخوذ ہوں گے۔ اس لیے یہ کہنا کہ ہم کوئی نئی چیز پیش کر رہے ہیں غلط ہوگا۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ گذشتہ عام انتخابات کی خامیوں اور اُن کی خوبیوں کو پیشِ نظر رکھ کر ہم نے یہ انتخاب ایک خاص معیار کے مطابق کیا ہے۔ جو اس درجہ کے طلبار کے ذہنی و ادبی

نشو و نما میں یقینی معاون ثابت ہوگا۔ ہم نے اردو زبان کے مسلم الثبوت اساتذہ اور ایسے ادبا و شعرا کو لیا ہے جنھوں نے اردو ادب میں کوئی انقلابی جد و جہد کی ہے اور اپنے لیے ایک خاص جگہ پیدا کرلی ہے۔

زبان اور ادب کے معیار کو برقرار رکھتے ہوئے مضامین کے انتخاب میں تنوع کا خیال رکھا گیا ہے۔ افادی پہلو نظر انداز نہیں کیے گئے ہیں ظاہری دلچسپی کا بھی خیال رکھا گیا ہے۔ تدریجی ترقی اور مطالعہ اور تنقید کی طرف رہنمائی کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

منتخب مضامین میں جملہ علوم و فنون کی رنگا رنگی موجود ہے۔ تاریخ، جغرافیہ، ادب، اخلاق، تنقید سب کچھ ہم نے جمع کر دیا ہے۔

حصۂ نثر میں ہر مصنف کے متعلق ابتدا میں کچھ مفید معلومات دے دی گئی ہیں جن میں ان کے ذاتی حالات اجمالی طور سے اور طرز تحریر کی خصوصیات تفصیلی طور سے بتائی گئی ہیں۔ حصۂ نظم میں شعرا کے سوانح مع تبصرہ کے آخر کتاب میں ملیں گے۔

ہمیں یقین ہے کہ ان انتخابات کے مطالعہ سے طلبا میں نہ صرف ذوق ادب کی تربیت ہوگی بلکہ ان میں خود بھی ابداع و تخلیق کی قوتیں نشو و نما پائیں گی۔

فہرست مضامین

میر امّن دہلوی

نام میر امان عرف میر امّن وطن دہلی۔ ان کے اجداد ہمایوں سے سرکار دہلی کے متوسل تھے۔ احمد شاہ درّانی کے حملہ کے بعد ان کو جلاوطن ہونا پڑا مگر اس جلاوطنی نے ان کو کئی شہروں کے رہن سہن اور بولی سے واقف کر دیا اسی سے ان کی زبان میں یہ خاص بات پیدا ہو گئی کہ ان کی اُردو ہر جگہ (جہاں جہاں اُردو بولی جاتی ہے) پسند کی جاتی ہے

دہلی چھوڑ کر یہ سیدھے عظیم آباد (پٹنہ) پہونچے اور پٹنہ کے دربار سے بہت دنوں فیض حاصل کر کے کلکتہ گئے اس زمانہ میں کلکتہ انگریزی کمپنی کا مرکز تھا یہاں انگریزی اور مشرقی تہذیب و معاشرت یک جا برتی جاتی تھی اس سے زبان پر بھی کافی اثر تھا۔ کلکتہ میں ایک رئیس کے یہاں بعہدہ اتالیقی ملازم ہو گئے۔

کچھ عرصے کے بعد گورنر جنرل کے میر منشی (میر بہادر علی) کے ذریعہ سے میر امّن کی رسائی جان گلکرسٹ تک ہوئی۔ یہ گلکرسٹ فورٹ ولیم کالج کے بڑے رکن رکین تھے ان کو ایسی کتابوں کی ضرورت تھی جن کے ذریعہ سے کمپنی کے وہ ملازم جن کی مادری زبان اُردو نہ تھی اُردو سیکھ سکیں۔ ملک میں اس وقت تک سوائے شعراء کے کلام کے کوئی نثر کی کتاب جو روزمرہ کی بولی میں

ہوتی تھی۔ شعرا کے دیوان اس کام میں نہیں لائے جا سکتے تھے۔

گلکرسٹ نے امّن سے یہ کام لیا کہ قصۂ چہار درویش کو (جس کو میر عطا حسین تحسین نے فارسی سے اُردو میں ترجمہ کیا تھا) روزمرہ کی بولنے والی زبان میں لکھوایا۔ تحسین کی کتاب نوطرز مرصّع کتابی زبان میں تھی (جیسی فسانہ عجائب ہے)

باغ و بہار کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ میر امّن کو زبان پر پوری قدرت حاصل ہے روانی اور سلاست کے علاوہ محاوروں کا استعمال اور زبان کے لوچ کو نہایت خوبی کے ساتھ نباہتے ہیں۔ اس کی مقبولیت کی بڑی دلیل یہ ہے کہ ۱۸۰۱ء سے اس وقت تک کہ تقریباً ڈیڑھ سو برس گزرے اس کی مقبولیت میں کوئی فرق نہیں آیا۔

ہر طبقہ کی زبان میں جو فرق ہوتا ہے اس کو نمایاں کر دیا ہے۔ اگر کہیں فارسی یا سنسکرت کے نامانوس الفاظ آ گئے ہیں تو وہ بھی دلکش معلوم ہوتے ہیں اس واسطے کہ اس کے بولنے والے وہی لوگ ہیں جن کو وہ بولنا چاہئے۔ اگر کہیں ایسے الفاظ ہیں جو لغت کے لحاظ سے غلط ہیں تو یہ وہی الفاظ ہیں جو اس زمانہ میں عوام کی زبان زد تھے۔

مختصر یہ کہ میر امّن نے باغ و بہار کی زبان کو ہر دل عزیز بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ یہ کتاب اس وقت بھی ویسی ہی پسندیدہ ہے جیسی ۱۸۰۱ء میں تھی۔

آزادبخت کی چار درویشوں سے ملاقات

ایک روز کتاب میں لکھا دیکھا کہ اگر کسی شخص کو غم یا فکر ایسی لاحق ہو کہ اس کا علاج تدبیر سے نہ ہو سکے تو چاہیے کہ تقدیر کے حوالے کرے اور آپ کسی گورستان کی طرف رجوع کرے درود طفیل پیغمبر کی روح کے ان کو بخشے اور اپنے تئیں نیست و نابود سمجھ کر دل کو اس غفلت دنیوی سے ہوشیار رکھے اور عبرت سے روئے اور خدا کی قدرت کو دیکھے کہ مجھ سے آگے کیسے کیسے۔ صاحب ملک و خزانہ اس زمین پر پیدا ہوئے لیکن آسمان نے سب کو اپنی گردش میں لا کر خاک میں ملا دیا جیسے یہ کہاوت ہے **دوہرا** چلتی چکی دیکھ کے دیا کبیرا روئے ÷ دو پاٹن کے بیچ آ ثابت گیا نہ کھوئے۔ آپ جو دیکھئے سوائے ایک مٹی کے ڈھیر کے ان کا کچھ نشان باقی نہ رہا اور سب دولت دنیا گھر بار آل و اولاد آشنا دوست نوکر چاکر ہاتھی گھوڑے چھوڑ کر اکیلے پڑے ہیں یہ سب ان کے کچھ کام نہ آیا بلکہ اب کوئی نام بھی نہیں جانتا کہ یہ کون تھے اور قبر کے اندر کا حال معلوم نہیں کیڑے مکوڑے چیونٹے سانپ ان کو کھا گئے یا ان پر کیا

بیتی اور خدا ے کیسی بنی یہ باتیں اپنے دل میں سوچ کر
ساری دنیا کو پیچھے کا کھیل جانے تب اس کے دل
کا غنچہ ہمیشہ شگفتہ رہے گا کسی حالت میں پژمردہ نہ ہوگا۔
یہ نصیحت جب کتاب میں مطالعہ کی بادشاہ کو خردمند وزیر
کا کہنا یاد آیا اور دونوں کو مطابق پایا یہ شوق ہوا کہ اس
پر عمل کرو لیکن سوار ہو کر اور بھیڑ بھاڑ لے کر بادشاہوں
کی طرح سے جانا اور پھر نامناسب نہیں بہتر یہ ہے کہ لباس
بدل کر رات کو اکیلے مقبروں میں یا کسی مرد خدا گوشہ نشین
کی خدمت میں جایا کروں اور شب بیدار رہوں شاید
ان مردان خدا کے وسیلے سے دنیا کی مراد اور عاقبت کی
نجات میسر ہو یہ بات دل میں مقرر کر گے ایک روز رات
کو موٹے جھوٹے کپڑے پہن کر روپے اشرفی لے کر چپکے چپکے
قلعے سے باہر نکلے اور میدان کی راہ لی جاتے جاتے ایک
روز گورستان میں پہنچے نہایت صدق دل سے درود
پڑھ رہے تھے اور اس وقت باد تند چل رہی تھی بلکہ آندھی
کہا چاہیے ایکبارگی بادشاہ کو دور سے ایک شعلہ سا نظر آیا کہ
مانند صبح کے ستارے کے روشن ہے۔ دل میں اپنے خیال کیا کہ
اس آندھی اور اندھیرے میں یہ روشنی خالی حکمت سے نہیں یا
یہ طلسم ہے کہ اگر پھٹکری اور گندھک کو چراغ میں بتی کے آس پاس

جھڑک دیجئے تو کیسی ہی ہوا چلے چراغ گل نہ ہوگا یا کسی ولی کا چراغ
ہے کہ جلتا ہے جو کچھ ہو سو چل کے دیکھا چاہیے شاید اس شمع کے
نور سے میرے بھی گھر کا چراغ روشن ہوا ور دل کی مُراد ملے۔ یہ
نیت کر کے اس طرف کو چلے جب نزدیک پہنچے دیکھا تو چار فقیر بینوا
کفنیاں گلے میں ڈالے اور سرزانو پر دھرے عالم بیہوشی میں خاموش
بیٹھے ہیں اور ان کا یہ عالم ہے جیسے کوئی مسافر اپنے ملک اور قوم سے
بچھڑ کر بیکسی اور مفلسی کے رنج و غم میں گرفتار ہو کر حیران
رہ جاتا ہے اسی طرح سے یہ چاروں نقش دیوار ہو رہے ہیں۔
اور ایک چراغ پتھر پر دھرا ٹمٹما رہا ہے ہرگز ہوا اس کو نہیں لگتی
گویا فانوس اس کا آسمان بنا ہے کہ بے خطرے جلتا ہے آزاد بخت
کو یہ دیکھتے ہی یقین آیا کہ مقرر تیری آرزو ان مردان خدا کے
قدم کی برکت سے بر آئے گی اور تیری اُمید کا سوکھا درخت اُن کی
توجہ سے ہرا ہو کر پھلے گا ان کی خدمت میں چل کر اپنا احوال کہیے
اور مجلس کا شریک ہو شاید تجھ پر رحم کھا کر دعا کریں جو بے نیاز کے
یہاں قبول ہو یہ ارادہ کر کے چاہا قدم آگے دھرے ودں ہیں عقل
نے سمجھایا کہ اے بے وقوف جلدی نہ کر ذرا دیکھ لے تجھے کیا معلوم ہے
کہ یہ کون ہیں اور کہاں سے آئے ہیں اور کدھر جاتے ہیں کیا جانیں
یہ دیو ہیں یا غول بیابانی ہیں کہ آدمی کی صورت بن کر باہم مل بیٹھے
ہیں بہر صورت جلدی کرنا اور ان کے درمیان جا کر مخل ہونا خوب نہیں

ابھی ایک گوشہ میں چھپ کر حقیقت ان درویشوں کی جاننا چاہیے
آخر بادشاہ نے یہی کیا کہ ایک کونے میں اس مکان کے چپکا جا بیٹھا
کہ کسی کو اس کے آنے کی خبر نہ ہوئی اپنا دھیان ان کی طرف لگا یا
کہ دیکھئے آپس میں کیا بات چیت کرتے ہیں اتفاقاً ایک فقیر کو چھینک
آئی اس نے شکر خدا کا کیا وہ تینوں قلندر اس کی آواز سے چونک
پڑے چراغ کو اکسایا ٹمٹک تو روشن تھا اپنے اپنے بستروں پر حقے بھر کر
پینے لگے ایک اُن آزادوں میں سے بولا اے یاران ہمدرد و رفیقان
جہاں گرد ہم چاروں صورتیں آسمان کی گردش سے اور لیل و
نہار کے انقلاب سے در بدر خاک بسر ایک مدت پھرے الحمد للہ
طالع کی مدد اور قسمت کی یاوری سے آج اس مقام پر باہم ملاقات
ہوئی اور کل کا احوال کچھ معلوم نہیں کہ کیا پیش آوے ایک
گمت رہیں یا جُدا جدا ہو جائیں۔ رات بڑی پہاڑ ہوتی ہے ابھی
سے پڑ رہنا خوب نہیں اس سے یہ بہتر ہے کہ اپنی اپنی سرگزشت
جو اس دنیا میں جس پر بیتی ہو بشرطیکہ جھوٹ اس میں کوڑی بھر
نہ ہو بیان کرے تو باتوں میں رات کٹ جائے جب تھوڑی شب
باقی رہے گی تب لوٹ پوٹ رہیں گے۔ سبھوں نے کہا یا ہادی
جو کچھ ارشاد ہوتا ہے ہم نے قبول کیا پہلے آپ ہی اپنا احوال جو
دیکھا ہے یا تم پر گزرا ہے شروع کیجئے تو ہم سب مستفیض ہوں۔

مرزا رجب علی بیگ سرور

یہ لکھنؤ ہی میں ۱۷۸۶ء میں پیدا ہوئے یہیں تعلیم و تربیت پائی فارسی عربی کی تعلیم کے ساتھ ساتھ خوشنویسی۔ موسیقی اور دیگر فنون میں بھی مشاقی حاصل کی۔ یہ بڑی خوش مزاق اور ظرافت پسند تھے۔ ہمیشہ دوستوں کے جمگھٹے میں رہتے تھے۔ مرزا غالب ان کے بڑے دوست تھے ۱۸۲۴ء میں غازی الدین حیدر بادشاہ اودھ نے ان کو کسی بات پر ناراض ہو کر کانپور جلا وطن کر دیا لیکن ان کے بعد نصیر الدین حیدر نے پھر خطا معاف کر کے بلا لیا۔ ۱۸۴۲ء میں امجد علی شاہ مرحوم نے انکا پچاس روپیہ ماہوار مقرر کر دیا تھا۔ غدر کے بعد ۱۸۵۹ء میں مہاراجہ ایشری پرشاد نراین سنگھ والی بنارس نے اپنے پاس بلا لیا۔ وہیں ۱۸۶۷ء میں انتقال کیا یہ دہلی۔ میرٹھ اور راجپوتانہ کے بہت سے شہروں میں پھرے تھے۔ ۱۸۶۲ء میں کلکتہ آنکھ کے آپریشن کے واسطے گئے تھے۔

سرور کا سب سے بڑا کارنامہ فسانۂ عجائب ہے۔ عبارت اس کی نہایت پر تکلف مقفیٰ مسجع۔ ہر جگہ رنگینی ہر فقرے کا دارو مدار بست غیر فطری اور تصنع سے بھرا ہوا۔ الفاظ سے دلکشی پیدا کی ہے۔ اُس زمانہ میں یہ طرز عبارت بہت پسند تھا۔ امرا فرمائش کر کے سرور سے کتابیں لکھواتے تھے جس طرح سرور

کے عہد میں سادی عبارت پر ہنستے تھے ویسے ہی اب سرور کی پرتکلف عبارت پر مذاق اڑایا جاتا ہے۔ یہ طرزِ تحریر، تکلیف دہ، غیر وسیع اور نہایت مشکل ہے۔ کوئی بات آسانی سے نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ ہر ہر قدم پر قافیہ، تشبیہ، استعارے کی تلاش رہتی ہے۔ اس کے لیے بڑی قابلیت اور زبان پر پوری دسترس کی سخت ضرورت ہے۔ سرسید کی "آثار الصنادید" اسی طرح کی کتاب ہے۔

لکھنؤ

سنا رضواں بھی جس کا خوشہ چیں ہے ۔۔۔ وہ بیشک لکھنؤ کی سرزمیں ہے

سُبحان اللہ و بحمدہ عجب شہر گلزار ہے ہر گلی کوچہ دلچسپ باغ و بہار ہے ہر شخص اپنے طور پر باوضع قطعدار ہے دورویہ بازار کس انداز کا ہے ہر دکان میں سرمایہ ناز و نیاز کا ہے ہر چند ہر محلے میں جہاں کا ساز و سامان مہیا ہے پر اکبری دروازے سے جلو خانے اور پکے پل تک کہ صراطِ مستقیم ہے کیا جلسہ ہے نانبائی خوش سلیقہ شیرمال کباب نان نہاری جہان کی نعمت اس آبداری کی جس کی بوباس سے دل طاقت پائے دماغ معطر ہو جائے فرشتہ گزرے تو سونگھے کیسا ہی سیر ہو ذرا نہ دیر ہو دیکھے سے بھوک لگ آئے وہ

سرخ سرخ پیازے نہاری کا بگھار سہلی جھنکار شیرمال شگرف کے رنگ کی خستہ بھربھری ایک بار کھائے نان نعمت کا مزہ پائے تمام عمر ہونٹ چاٹا کرے کباب اس آب و تاب کا کہ مرغ و ماہی کا دل کھینچ آہ پر حسرت محرومی سے کباب ادرک کا نچا میاں خیر اللہ کی دکان کا مال سے باریک کتر اہلِ ضمہ نایاب حسینی کے جلوہ سوہن پر عجب جوبن اس کی شیرینی کی گفتگو میں لب بند جہان کو پسند۔ پیڑی دبیز بسی بسائی لذیذ ہونٹ سے کھائے دانت کا اس پر تمام عمر دانت رہے دانت لگانے کی نوبت نہ آئے جوزی خوب جبتی اہل ہند کو مرغوب دودھیا شیرخوارہ نوش کر جائے ہر گنجڑن کی وہ تیکھی چتون آدمی صورت دیکھتا رہے رعب حسن سے بات نہ کر سکے سن کرنین پریزاد سروقامت رشک شمشاد دکانوں میں انواع واقسام کے میوے قرینے سے چنے روزمرے محاورے ان کے دیکھے نہ سنے کبھی کوئی پکار اٹھی میاں ٹکے کو ڈھیر لگا دیا ہے کوئی موزوں طبیعت یہ فقرہ سناتی مزہ انگور کا ہے رنگتروں میں کسی طرف یہ صدا آتی ہے گنڈیریاں ہیں پونڈے کی ایک طرف تنبولی سرخروئی سے یہ رمز کنایہ کرتے بولی ٹھولی میں چبا چبا کر ہر دم یہ دم بھرتے کھیئے کا منہ کالا ہو یا گید کر ڈالا عنبر ہے نہ گلال ہے کتھے چونے ادھی میں مکھڑا لال ہے گلیوں میں گجر دم یہ آواز آتی ہے شیرمال ہے گھی اور دودھ کی مفلس کا دل اچاٹ ہے ٹکوں کی چاٹ ہے کدھر لینے والے ہیں نمش کی قفلیاں اور کھیر کے پیالے

ہیں۔ کیا خوب گُھنے بھُر بھُرے ہیں چنے پر مل اور مُرمُرے ہیں۔ جیٹھ
بیساکھ کی وہ گرمی جس میں چیل انڈا چھوڑتی ہے دو پیسے کو برف کی
قفلی جبی دو کھائے بدن ٹھٹھر جائے زیادہ ہو کا کرے لقوے فالج میں
مرے۔ سرجوک ہمیشہ شانے سے شانہ چھلا نسیم وصبا کو سیدھا رستہ
نہ ملا شیخ کونی کی مٹھائی جس نے کھائی جہان کی شیرینی سے دل کھٹا
ہوا بنارس کا کھجلا بھولا متھرا کے پیڑے کا ٹھٹھا ہوا برفی کی نفاست
بو باس درد داہن نقرئی ورق کا جوبن کسی اور شہر کا رکابدار اگر دیکھ
پائے یا ذائقہ لب پر آئے زندگی تلخ ہو ہاتھ کاٹ کاٹ کر کھائے
امرتی مسلسل کا ہر پیچ ذائقہ کو بیچ تاب دیتا یاقوتی مفرح کا مزہ جب
منہ میں رکھا اصل تو یہ ہے عسل مصفا جنّت کی نہر کا حلق سے اُترا
براچیوں کی گلی کی کھجور لذت سکتی ذائقے میں چور بہتر از انگور
نہایت آب و تاب ہم خرما و ہم ثواب بالائی نورا کی دکان پر
جب نظر آئی بے قند و شکر شکر کر دو علی نور کہہ کر چھری سے کاٹ
کر کھائی۔ مداریے حقے وہ ایجاد ہوئے کمنگر ایسے اُستاد ہوئے کہ
جب تڑا قا ان کا سُنا بیچوان کا دم بند ہوا بیچانا کا تمبا کو مشک و
عنبر کی خوشبو جس نے ایک گھونٹ کھینچا اُسی کا دم بھرنے لگا۔
علی الخصوص مرد تماش بین کے واسطے یہ شہر خدا ہے یہاں ہر
فن کا اُستاد ہے سکڑوں گھامڑ بد عقل کندۂ ناتراش اطراف
وجواب سے آ شفتہ عشرے میں چھل چھلا وضعدار ہو گئے۔ جب

ابو تراب خاں کے کٹڑے میں جا میاں خیراتی سے کسی کی خیرات میں خط بنوایا بارہ برس کے سن کا گالوں سے مزہ آیا چاہ پھر کھونٹی ٹوٹی پتہ نہ پایا کاتب قدرت کا لکھا مٹاتا ہے ایسا خط بناتا ہے سید حسین خاں کے دروازے پر عبداللہ عطر فروش کی دُکان جا ئے نشست ہر وضعدار جوان ہے دو پیسے میں بیچے چنبیلی کا تیل نہ میل پیل فتنہ برپا کرنے والا! ایسا ملا کہ سہاگ کا عطر گرد ہوا جو نیوڑے سے دل سرد ہوا۔ عطر کی زدولی رکھی کان میں پھر جا بیٹھا کسی افیونی کی دکان میں سفید سفید چینی کی پیالیاں خوبصورت، انگشتیں نما لیاں افیون فیض آباد والے کی وہ رنگین جس نے تریاک مصر کے نشے کر دیے کیے زیادہ پی جانے والوں کو جان کے لالے ہوئے ایسے متوالے ہوئے جھگڑا بادۂ ارغوانی و زعفرانی کا پیدا تبدیل ذائقہ کو فرنی کے خوانچے نقرئی ورق جنے پستے کی ہوائی چھڑکی ہوئی تھا۔ چسکی پی ایک دم کے بعد دم حقے کا کھینچا آنکھوں میں سرور موجود ہوا وہاں سے بڑھا کان میں آواز آئی کہ میلے کے بازیں شوقین البیلے کو بہن لے چلا جا فرنگی محل کے میلے کو تب یہ صبح ہی بگڑا ہیجوں کے بل چلا یہ بھولا کہ وطن کی چال ڈھال راہ و رسم بھولا اکثر باہر سے آیا یہ دھج بنا جو نیور کے قاضی ہولے کو مفتی میں راضی ہو گئے۔ برسات کا اگر موسم ہے شہر کا یہ عالم ہے ادھر مینھ برسا پانی جا بجا بہہ گیا گلی کوچہ

صاف رہ گیا ساون بھادوں میں زردوزی جوتہ پہن کر پھرے۔ کیچڑ
تو کیا مٹی نہ بھرے فصل بہار کی سند پروردگار کی قدرت رضوان
جن کا شایق دیکھنے کے لایق روز عیش باغ میں تماشے کا میلا ہر وقت
چین کا جلسہ موتی جھیل کا پانی چشمۂ زندگانی کی آب و تاب دکھاتا
پیاسوں کا دل لہراتا سڑک کے درختوں کی فضا جدا کھجوا ہو جیں مارتا
ہارسنگھار کے جنگل میں لوگوں کا جمگھٹا رنگا رنگ کی پوشاک آپس
کی جھانک تاک تختۂ لالۂ نافرمان جن پر قربان بندہائے خاص کی
سبک روی خرام ناز ہر قدم پر کبک دری چال جبین نیاز رگڑتی شاخ
سروان کے روبرو نہ اکڑتی شایق ہزار ہزار شمع بے پروانوں کا عالم
غول کے غول باہم آم کے درختوں میں ٹپکا لگا جھولا وہیں پڑا جھولنے
والوں پر دل ٹپکا پڑتا محبت کے پینگ بڑھتے دیکھنے والے درد د
پڑھتے باغ میں کوئل، پپیہے، مور کا شور جھولے پر گھٹا رہی اور بھی
گھنگھور ساون بھادوں کے جھالے وہ رنگین جھولنے والے دشت
غربت میں یہ جلسہ جو یاد آجاتا ہے دل پاش پاش ہو جاتا ہے۔
کلیجہ منھ کو آتا ہے نہ کہ کانپور کی برسات ہیہات دخل کیا
دروازے سے باہر قدم دھرے اور پھسل نہ پڑے گلی میں پاؤں
رکھا کیچڑ کا چھپکا سر پر پہنچا دو اس فصل میں باہم نہ دیکھے مگر چیلے
کے پھنسے اور جنھیں سواری کا مقدور نہیں دخل کیا جو وہ جائیں
کہیں ان کے حق میں برسات حوالات۔ گھر جیلخانہ نہ کہیں جانا نہ ہیں

آنا۔ اگر خواب میں کہیں نکل گئے تو چونک پڑے کہ پھسل گئے اور جو
بازاری کاروباری ہیں ان کا یہ نقشہ دیکھا ہاتھ میں جوتیاں پائنچا
چڑھا کیچڑ میں لت پت یہاں گرے وہاں گرے خدا خدا کر جیتے
گھر پھرے اور جو شیخی کے مارے ننگے پاؤں نہ نکلے تو

شعر

دیکھی ہے یہ رسم اس نگر میں جوتا ہے گلی میں آپ گھر میں

پھر برسر مطلب آیا خاص بازار کہ شہر وسیع و خوش قطع ہے اس کے
نقش سے مانی و بہزاد نے خار کھایا شبیہ کشی کیا خاکہ خاک نہ کھینچا
ہاتھ بھر آیا کوٹھیاں فرح بخش و دلکشا برج ہر ایک جہاں نما سلطان
منزل و استری مخزن نشاط افزا تو بہ شکن انسان کو دیکھ کر سکتہ
ہو جائے کام ان کا وہم و قیاس میں نہ آئے سر راہ کی بارہ دری
جواہر سے جڑی پری کی صورت کی قریب نہر جاری تکلف کی تیاری۔
پائیں باغ اس کا جس نے دیکھا باغ ارم سمجھا سوسن صفت ہزار
زبانیں بہم پہونچیں تعریف نہ کر سکا گونگے کا سپنا ہوا رومی دروازہ
اس رفعت و شان کا ہے گزرگاہ ایک جہان کا ہے اگر اس پر
چڑھ جائے بام فلک پست معلوم ہو فرشتوں کا مشورہ کان
میں آئے بھرا و لین اس کی زمین ہے ششجہت میں دوسرا انہیں
سنہ۔ مسجد انتخاب ہے امام باڑہ لاجواب ہے مقبرے عالیشان
وہ نادر مکان کہ خاک بدیدۂ انجم نگراں ہے ایک سے نظیر کی جستجو

ہیں متصل مہ و خورشید روز و شب روشن کئیے کو بکو سرگرداں ہے۔
اگر پاؤں پھیلانے کی جگہ ان میں ہاتھ آئے سردست مرجانے کو جی
چاہے گومتی کے اندازے نہر کی کیفیت نظر آتی ہے طبیعت لہراتی ہے
دورویہ آبادی عمارت کہیں رمنے کسی جا باغ ہے صبح و شام وہ
بہار نظر آتی ہے کہ شام اودھ اور بنارس کی سحر بھول جاتی ہے شہر
نفیس مجمع رئیس ہر فن کا کامل یہاں حاصل ہے خوشنویس حافظ
ابراہیم صاحب اس قطع کا قطعہ لکھا جو میر علی یا آغا جیتے ہوتے
اپنے لکھے کو روتے اشک حسرت سے وصلیاں دھوتے۔ مرزائی صاحب
کا یہ حال تھا کوئی پرچہ ان کا ان کی نظر پڑ جاتا فیروزہ بر زبر زکھتا
یاقوت رقم میرا کہاتا۔ مرثیہ خواں جناب میر علی صاحب نے وہ طرز نو
مرثیہ خوانی کا ایجاد کیا کہ چرخ کہن نے مسلم الثبوت اُستاد کیا۔ علم
موسیقی میں یہ کمال بہم پہونچایا اس طرح کا دھرپت خیال ٹپہ گایا
اور بتایا اگر کبھی کسی نائک کے وہم و خیال میں نہ آیا تھا ایک رنگین
احاطہ کھینچا ہے جو اس میں آیا پھولا پھلا وہ ان کا پیرو ہوا اور جس
نے ڈھنگ جدا کیا وہ ٹکسال باہر بدرنگ ہوا اگر تان سین جیتا ہوتا
ان کے نام پر کان پکڑتا بھیک مانگ کھاتا مگر نہ گاتا ہزاروں شاگرد
جگت استاد ہوا مولوی سب میں برگزیدہ ہوا۔ امیروں میں حسین علی خاں
بلبل ہزار داستان خوش الحان مرثیہ گو بے نظیر میاں دلگیر صاف
باطن نیک ضمیر خلیق فصیح مرد مسکین مگر دبات زمانہ سے کبھی افسردہ نہ تھا

اللہ کے کرم سے ناظم خوب ذہن مرعوب سخن بہر طالع بصورت گدا بار احسان اہل دول کا نہ اٹھایا عرصۂ قلیل میں مرثیہ سلام کا دیوان کثیر فرمایا طبیب ہر ایک مسیحائی کرتا ہے قم باذنی کا دم بھرتا ہے جسے دیکھا بقراط سقراط جالینوس زمان ہے اس معنی میں یہ خطہ رشک زمین یونان ہے میرک جان صاحب پیرسنے کے فن سے ایسے آشنا ہوے کہ مردم بحر و بر سرگرم ثنا ہوے شاعر زباندان ایسے کہ عرفی اور خاقانی کی غلطی بتائی فردوسی و انوری کی یاد بھلائی شیخ امام بخش ناسخ نے ہندی کی چندی کی اور روزمرے کو ایسا فصیح اور بلیغ کیا کہ کلام سابقین منسوخ ہوا فصحاے شیراز و اصفہان اس سیف زبان کا لوہا مان گئے اپنے قبح پر منفعل ہوے اس زبان کا حسن جان گئے زمین شعر کو آسمان پر پہنچایا سیکڑوں کو استاد بنایا۔ خواجہ حیدر علی آتش کی آتش بیانی تمرد افشانی سے دل جلوں کے سینے میں سوز و گداز ہے مرد قانع شاعر ممتاز ہے۔ فرنگی محل کا حال کیا لکھوں کہاں زبان دوست کا یارا جو شمہ لکھتا مولوی فاضل عدیم المثال ہر شخص جمیع علوم کا اُستاد کتب درسی ابتدا سے انتہا تک یاد منقول و معقول میں دقیقہ باقی نہ رہا ریاضی کے ریاض سے آسمان کو زمین کر دیا۔ مولوی انوار کا پرتو فیض جہان میں روشن مولوی مبین دور بین سراج انجمن مولوی ظہور اللہ سبحان اللہ جیسے فقیہہ محقق کہاں ہوتے ہیں یہی لوگ نادر الزماں ہوتے ہیں ادھر رکن

دین بلا کد میر سید محمد مجتہد مستند مرزا کاظم علی متقی اخوند محمد رضا رضائے خدا کا جویا حامل قرآن ہمہ داں کسی علم میں عاری نہیں روئے زمین پر آقا محمد تبریزی سا قاری نہیں مگر وہ جو مثل ہے نیک اندر بدیہ اصل ہے لب معشوق مولویوں سے وہ رنڈیاں پری شمائل زہرہ پیکر مشتری خصائل حسن و ماز و انداز سحر کرامات غمزہ عشوہ ادا گاہ بانکی کہ ہاروت و ماروت تو کیا معاذ اللہ اگر سب فرشتے عرش سے فرش خاک پر آئیں ان کی چاہ میں لکھنؤ کے کنوئیں بھر جائیں گھڑی بھر ان سے زانو بزانو بیٹھے تو بتہ نصوح ٹوٹے ان کا دروازہ نہ چھوٹے۔ لوئی چرخ ان پر نثار ہے ہر ایک حور کردار ہے خوش مزاج مردم شناس روزمرہ شستہ دم تقریر رمز و کنایہ اس کوچے کے فیض سے انسان آدمیت بہم پہنچاتا ہے۔ تراش خراش اثر صحبت سے کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے کلاونت قوال بیتال چھجو خاں غلام رسول سب کو موسیقی میں کمال حصول شوری کی منہ زوری کی دھوم ہے ٹپے کا موجد ہوا سب کو معلوم ہے۔ بخشو اور سلاری نے طبلہ ایسا بجایا کہ پکھاوج کو شرمایا۔ پتنگ ایسا بنا ایسا لڑا کہ نزدیک و دور مشہور ہے ستر چھتر تار ڈور کا پتنگ خیراتی یا جھنگا کے ہاتھ کا لڑائی کی گھات کا۔ رستم کی عافیت تنگ کرنے والا المعنی ہاتھ پاؤں پر مولوی عمدہ نے ایسا لڑایا عمداً اتنا بڑھایا کہ کردبیوں سے عبادت چھوٹی دوڑ دوڑ کر ڈور لوٹی آنکھ بچا کر بیٹا توڑا فرشتے خاں کا پتنگ نہ چھوڑا۔ مرداں بیگ مانجھا دینے والا دیکھا نہ سنا

غرضکہ جو چیزیں یہاں نئی بنیں اور ایجاد طبیعت سے کاریگروں نے نکالیں سلف سے آج تک نہ ہوئی تھیں۔ اوگی زردوزی، ایسی بنی ایسی بارہ کی چھٹی کہ باہر بندواس کے اپنے چوپائیں بجائے جیغہ و سرپیچ سر پر لگائیں۔ جوتا خُرد نوک کا ببر علی نے اس نوک جھونک کا بنایا کہ جہان کو پسند آیا۔ آرام پائی جس کے ہاتھ آئی دل نے چین پایا چالیس سال دیکھ بھال کی ایسا شہر ایسے لوگ نظر سے نہ گزرے اور تو اور شہدا پیر بخارا کا ٹھاسا سید الشہدا کا شیدا برس روز میں جو پیدا کیا عشرہ محرم میں محتاجوں کو نذر حسین کھلا دیا۔ یہ یکرنگی مزاج میں سمائی تمام سن جوا کھیلا دوسے کے داؤں پر ادھی نہ لگائی۔ ایک روپیہ ہوا خواہ سو کہدیا پو سیکڑوں داؤں مچے گئے۔ منہ سے نہ نیچے گئے وہاں بھی ایک چوک لگا رہتا ہے۔ آدمی کے چھکے چھوٹ جاتے ہیں جب وہ لوگ نظر آتے ہیں مشائخ فقیروں کے مزار خوب خواب راحت میں آسودہ سالک و مجذوب شاہ میناشاہ پیر محمد شاہ خیر اللہ شاہ ایک سے ایک سبحان اللہ ظاہر مردہ حقیقت میں جیتے ہیں اشیائے لطیف کھاتے پیتے ہیں۔ مولوی عبدالرحمٰن برگزیدہ یزدان عالم باعمل درویش اکمل۔ خواجہ باسط اور میر نصیر جن کا عدیل نہ نظیر خواجہ حسین و حسن سرگروہ انجمن۔ طبیعت بسکہ مصروف باختصار ہے ایک ایک فقرہ لکھا ہے وگرنہ ان بزرگواروں کی صفت میں کتابیں تحریر کرے تو بجا ہے۔

مرزا اسد اللہ خاں غالب

نجم الدولہ۔ دبیر الملک۔ نظام جنگ۔ خطاب۔ مرزا نوشہ لقب۔ اسد اللہ خاں نام۔ غالب تخلص۔ پہلے اسد بھی تخلص تھا۔ ان کا سلسلہ نسب افراسیاب بادشاہ توران سے ملتا ہے۔ ان کے چچا۔ باپ۔ دادا سب فوجی حکام تھے اسی واسطے ان کا قول ہے ؎

سو پشت سے ہے پیشہ آبا سپہ گری
کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

ان کی مادری زبان فارسی تھی۔ پہلے فارسی ہی میں شعر کہتے تھے نثر بھی فارسی میں لکھتے تھے۔ (۱) مہر نیم روز (۲) ماہ نیم ماہ (۳) دستنبو یہ ان کی مشہور فارسی تصانیف ہیں۔ کلیات غالب فارسی میں تمام صنائع شعر پر حاوی ہے۔

بہادر شاہ (مغل شہنشاہ) نے پچاس روپیہ ماہوار وظیفہ دیا تھا۔ رامپور سے سو روپے بعد غدر مقرر ہوئے۔ ۷۲ برس کی عمر میں ۱۸۶۹ء میں انتقال ہوا۔ مولانا آزاد نے "آہ غالب بمرد" سے تاریخ نکالی۔

غالب نے فن انشا میں ایک نیا اور نہایت پسندیدہ راستہ نکالا۔ یعنے خطوط میں القاب و آداب کا پرانا از کار رفتہ طریقہ چھوڑ کر وہ ڈھنگ ڈالا کہ خط پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دو آدمی آمنے سامنے بیٹھے ہوئے بات چیت کر رہے ہیں "خط سے آدھی ملاقات ہوتی ہے"

گئے معولہ کو حقیقتاً غالب نے اردو میں صحیح طور سے برت کر دکھا دیا۔ واقعات کو اس طرح لکھتے ہیں کہ دل پر فوراً اثر ہو موقع اور محل کا ہر جگہ لحاظ رکھتے ہیں۔ کسی جگہ کا نقشہ کھینچتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ گویا وہ جگہ یا وہ منظر آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ ان کی تحریر میں ان کی فطرتی خوش مزاجی اور ظرافت ظاہر ہوتی ہے۔ اسی واسطے کہا جاتا ہے کہ۔

"غالب نے مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا"
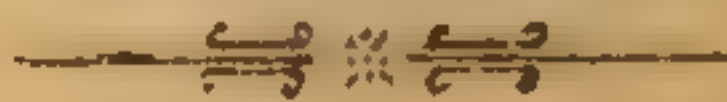
خطوطِ غالب

(۱) میر سرفراز حسین کے نام

نورِ چشم راحت جان میر سرفراز حسین جیتے رہو اور خوش رہو تمہارے دستخطی خط نے میرے ساتھ وہ کیا جو بوئے پیرہن یوسفؑ نے یعقوبؑ کے ساتھ کیا تھا۔ میاں یہ ہم تم بوڑھے ہیں یا جوان ہیں، توانا ہیں یا ناتوان بڑے بیش قیمت ہیں یعنی بہر حال غنیمت ہیں کوئی جلا بھنا کہتا ہے۔

شعر

یادگارِ زمانہ ہیں ہم لوگ — یاد رکھنا فسانہ ہیں ہم لوگ

وہی بالا خانہ ہے اور وہی میں ہوں سیڑھیوں پر نظر ہے کہ وہ میر مہدی آئے اور میر سرفراز حسین آئے وہ یوسف مرزا آئے وہ

میرن آئے وہ یوسف علی خاں آئے مرے ہوؤں کا نام نہیں لیتا بچھڑے ہوؤں میں سے کچھ گئے ہیں اللہ اللہ ہزاروں کا میں ماتم دار ہوں میں مروں گا تو مجکو کون روئے گا۔ سنو غالب رونا پیٹنا کیا کچھ اختلاط کی باتیں کرو کہو میر سرفراز حسین سے کہ یہ خط میر مہدی کو پڑھوا دُ اور میرن صاحب کو بلاؤ کل شام کو یا پرسوں شام کو میر اشرف علی صاحب میرے پاس آئے تھے کہتے تھے کہ کل یا پرسوں پانی پت کو جاؤں گا میں نے ان کی زبانی کچھ پیام میرن صاحب کو بھیجا ہے اگر بھول نہ جائیں گے پہنچائیں گے [خلاصہ اس کا یہ ہے کہ صاحب ابن نہیں ہے نہ ہو غلام اشرف نہیں ہے نہ ہو اگر منظور کیجئے تو میں صوفی ہوں ہمہ اوست کا دم بھرتا ہوں بموجب مصرعہ کے ع

دل بدست آور کہ حج اکبر ست

تم سے کب انکار کرتا ہوں اگر مرزا گوہر کی جگہ مانو تو خوش، اگر غلام اشرف جانو تو راضی] رات کو اپنے گھر میں باتیں بنا دُ دن کو مجھ سے جی بہلاؤ۔ قصہ مختصر آؤ اور جلد آؤ سید انور کا جو حال لکھتے ہو وہ سچ ہے راجپوت ایسا ہی کچھ کرتے ہیں مگر مہاراجہ مسلمانوں کا دم بھرتے ہیں [دن جاتے ہیں کہ یہ لوگ وہاں پھر آتے ہیں کیا مجمع بزہم ہوا ہے مجکو کیسا غم ہوا ہے تم اس جرگے سے جدا ہو تم کو اندیشہ کیا ہے] میر قربان علی صاحب جیسا لکھیں ویسا کرو میر مہدی صاحب ہمارا خط پڑھ کر کہیں گے مجکو دعا بھی نہ لکھی بھائی میری دعا پہونچے
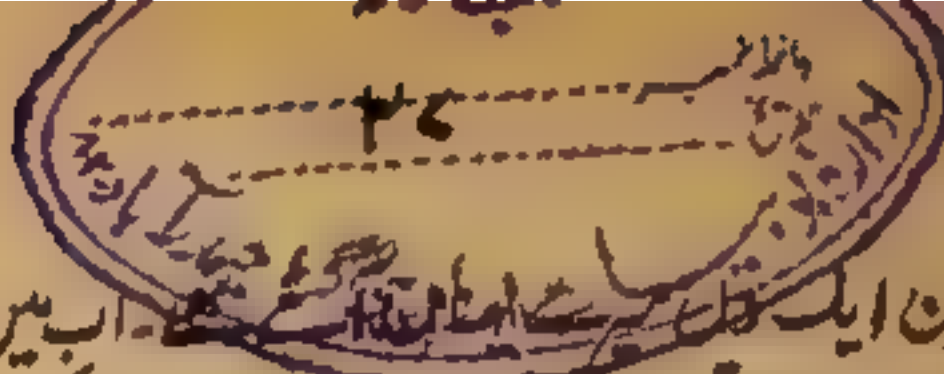
میر نصیر الدین ایک طفل ہے اب میں نہیں جانتا یہاں ہیں یا وہاں ہوں تو دعا کہنا۔ میرن صاحب کے نام تو اتنا کچھ پیام ہے دعا سلام کی کیا حاجت دیکھو ہم اپنا نام نہیں لکھتے۔ بھلا دیکھیں تو سہی تم جانتے ہو کہ یہ خط کس کا ہے۔

---

(۲) مرزا یوسف علی خاں عزیز کے نام

بھائی تم کیا فرماتے ہو۔ جان بوجھ کر انجان بنے جاتے ہو۔ واقعی غدر میں میرا گھر نہیں لٹا، مگر میرا کلام میرے پاس کب تھا کہ نہ لٹتا ہاں بھائی ضیاءالدین خاں صاحب اور ناظر حسین مرزا صاحب ہندی اور فارسی نظم و نثر کے مسودات مجھ سے لے کر اپنے پاس جمع کر لیا کرتے تھے سو ان کے گھر میں پر جھاڑو پھر گئی۔ نہ کتاب رہی نہ اسباب رہا۔ پھر اب میں اپنا کلام کہاں سے لاؤں۔ ہاں تم کو اطلاع دیتا ہوں کہ مئی کی گیارھویں ۱۸۵۷ء سے جولائی کی اکتیسویں ۱۸۵۸ء تک، پندرہ مہینے کا اپنا حال میں نے نثر میں لکھا ہے اور وہ فارسی زبان قدیم میں ہے کہ جس میں کوئی لفظ عربی نہ آئے اور ایک قصیدہ فارسی متعارف میں جناب ملکہ معظمہ انگلستان کی ستائش میں اس نثر کے ساتھ شامل ہے۔ یہ کتاب مطبع "مفید خلائق" آگرہ میں منشی نبی بخش صاحب حقیر اور مرزا حاتم علی مہر اور منشی ہرگوپال تفتہ کے اہتمام سے چھاپی گئی ہے۔ فی الحال

مجموعہ میری نظم و نثر کا اس کے سوا اور کہیں نہیں۔ اگر جناب منشی امیر علی خاں صاحب میرے کلام کے مشتاق ہیں تو یہ نسخہ موسوم بہ "دستنبو" مطبع "مفید خلائق" سے منگالیں اور ملاحظہ فرمائیں۔

(۴) منشی حبیب اللہ خاں ذکا کے نام

میرے مشفق شفیق مجھ سے ہیچ و پوچ کے ماننے والے مجھ سے بُرے کو اچھا جاننے والے۔ میرے محبوب۔ میرے محبوب تم کو میری خبر بھی ہے۔ آگے ناتواں تھا اب نیم جان ہوں آگے بہرا تھا اب اندھا ہوا چاہتا ہوں۔ رامپور کے سفر کا رہ آورد وہ ہوں۔ رعشہ و ضعف بصر جہاں چار سطریں لکھیں انگلیاں ٹیڑھی ہوگئیں حرف سوجھنے سے رہ گئے۔ اکہتر برس جیا بہت جیا اب زندگی برسوں کی نہیں مہینوں اور دنوں کی ہے۔ پہلا خط تمہارا پہنچا۔ اس سے تمہارا مریض ہونا معلوم ہوا متواتر دوسرا خط مع غزل آیا غزل کو دیکھا سب شعر اچھے۔ ورلطیف حافظہ کا یہ حال ہے کہ غزل کی زمین یاد نہیں اتنا یاد ہے کہ ایک شعر میں کوئی لفظ بدلا گیا تھا۔ غرضکہ وہ غزل بعد مشاہدہ تم کو بھیجی گئی اور لکھا گیا کہ نوید حصول صحت جلد بھیجو کل ایک خط رجسٹری دار آیا۔ گویا ستارہ دنبالہ دار آیا۔ حیران کہ ماجرہ کیا ہے۔ بارے کھولا اور دیکھا خط نوید رفع مرض وحصول صحت سے

خالی اور شکوہ ہائے بیجا سے لبریز۔ صاحب میرے نام کا خط جہاں سے روانہ ہو وہیں رہ جائے تو وہ رہ جائے ورنہ دلی کے ڈاکخانہ میں پہنچ کر کیا مجال ہے جو مجھ تک نہ پہنچے۔ وہاں کے ڈاک کے کارپردازوں کو اختیار ہے۔ مکتوب الیہ کو دیں یا نہ دیں۔ آپ مرزا صابر کا تذکرہ مانگتے ہیں اس کا یہ حال ہے کہ غدر سے پہلے چھپا اور غدر میں تاراج ہو گیا۔ اب ایک مجلد اس کا کہیں نظر نہیں آتا۔ بس اب مجھے اتنا کہنا باقی ہے کہ اس خط کی رسید اور اپنی خیر و عافیت جلد لکھو۔ جواب خط کا طالب غالب

صبح جمعہ ۲۵۔ ذی الحجہ ۱۲۸۲ھ۔ ۱۲۔ مئی ۱۸۶۶ء

(۴) منشی ہرگوپال تفتہ کے نام

کیوں صاحب مجھ سے کیوں خفا ہو۔ آج مہینہ بھر ہو گیا ہو گا یا بعد دو چار دن کے ہو جائے گا کہ آپ کا خط نہیں آیا انصاف کرو کتنا کثیر الاحباب آدمی تھا کوئی وقت ایسا نہ تھا کہ میرے پاس دو چار دوست نہ ہوتے ہوں اب یاروں میں ایک شیوجی رام برہمن اور بالمکند اس کا بیٹا یہ دو شخص ہیں کہ گاہ گاہ آتے ہیں اس سے گذر کر لکھنؤ اور کالپی اور فرخ آباد اور کس کس ضلع سے خطوط آتے رہتے تھے ان دوستوں کا حال ہی نہیں معلوم کہ کہاں ہیں اور کس طرح ہیں

وہ آمد خطوط کی موقوف تم تین صاحبوں کے آنے کی توقع اس میں
وہ دونوں صاحب گاہ گاہ۔ ہاں ایک تم ہو کہ ہر مہینے میں ایک دوبار
مہربانی کرتے ہو۔ سنو صاحب اپنے پر لازم کرلو ہر مہینے میں ایک
خط مجھ کو لکھنا اگر کچھ کام آ پڑا دو خط تین خط ورنہ صرف
خیر و عافیت لکھی اور ہر مہینے میں ایک بار بھیجدی بھائی صاحب
کا بھی خط دس بارہ دن ہوئے کہ آیا تھا اس کا جواب بھیج دیا گیا۔
مولوی قمرالدین خاں یقین ہے کہ الہ آباد گئے ہوں کس واسطے کہ
مجھ کو مئی میں لکھا تھا کہ اوائل جون میں جاؤں گا بہر حال اگر
آپ آزردہ نہیں تو جس دن میرا خط پہنچے اس کے دوسرے دن
اس کا جواب لکھئے۔ اپنی خیر و عافیت منشی صاحب کی خیر و عافیت
مولوی صاحب کا احوال اس سے سوا گوالیار کے فتنہ و فساد کا ماجرا
جو معلوم ہوا ہو وہ الفاظ مناسب میں ضرور لکھنا۔ راجہ جو وہاں
آیا ہوا ہے اس کی حقیقت دھولپور کا رنگ صاحبان عالیشان
کا ارادہ وہاں کے بندوبست کا کس طرح پر ہے۔ آگرہ کا حال
کیا ہے وہاں کے رہنے والے کچھ خائف ہیں یا نہیں۔

غالب نگاشتہ شنبہ ۱۹ جون ۱۸۵۸ء

سرسید احمد خاں

سرسید احمد خاں فقط مصلح و محسن قوم ہی نہ تھے بلکہ ان کی ممنون زبان اُردو بھی ہے ۱۸۱۷ء میں دہلی میں پیدا ہوئے ۱۸۹۸ء میں علیگڑھ میں انتقال کیا کالج کی مسجد کے صحن میں دفن ہوئے۔ زمانہ کے طریقہ کے بموجب گھر پر تعلیم پائی۔ ان کو کتابوں کے مطالعہ کا بہت شوق تھا آثار الصنادید اگلے زمانہ کی طرز کی عبارت کی ایک کتاب جس میں ہندوستان کی تاریخی عمارتوں کا تفصیلی حال ہے فسانہ عجائب کے طرز پر لکھی ہے۔ غازی پور کے قیام کے زمانہ میں سائنٹفک سوسائٹی قائم کی۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ مسلمان یورپ کی ترقیوں اور خیالات سے متاثر ہو کر اپنی بُری رسمیں ترک کریں اور اپنے طرز زندگی کو مغربی اصول زندگی سے سمولیں۔ یہ ۱۸۶۹ء میں انگلینڈ گئے تھے کہ وہاں کی تعلیم گاہوں کو دیکھ کر علی گڈھ کالج میں اسی طریقہ پر تعلیم کا طرز پیدا کریں۔ رسالہ "تہذیب الاخلاق" وہاں سے آکر جاری کیا جس میں مختلف باتوں پر مضامین لکھے ہیں۔ بُری رسمیں خراب و فرسودہ رواج کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی ہے۔ پہلی کتاب نئی طرز (سادہ و عام فہم عبارت) میں "اسباب بغاوت ہند" لکھی ہے۔

سرسید کی عبارت سادی عام فہم تشبیہ و استعارہ اور دیگر صنائع

سے پاک وصاف ہے قافیہ اور سجع کا لحاظ بالکل نہیں رکھا ہے پر دعویٰ
کو دلیلوں سے مضبوط کر کے پیش کرتے ہیں۔ مشکل سے مشکل مسئلہ کو نہایت
آسانی سے سہل الفاظ میں دل نشین کر دیتے ہیں۔ ان کے کلام میں
"درستگی بیباکی سادگی خاص جوہر ہیں" الفاظ سیدھے سادے
اور روزمرہ میں استعمال ہونے کی وجہ سے عام فہم۔
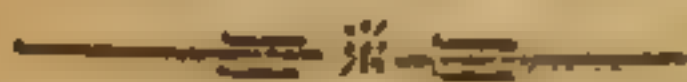
طالب علموں کے نام ایک خط

میرے عزیزو! تم نے اس منزل ہستی میں قدم رکھا ہے اور
میں بہت سے مرحلے طے کر چکا ہوں۔ زندگی کی پُر فضا اور پُر بہار
پہاڑی پر چڑھ کر اس کے عجائبات اور غرائبات کو ایک نظر سے
دیکھ کر مایوس قدموں اور حسرت بھرے دل سے نشیب کی طرف
اُتر رہا ہوں۔ اور زیادہ افسوس میرا اس سبب سے ہے کہ عمر کی
پہاڑی کی سیر کرتے وقت جو اوزار مجھے قدرت نے عنایت کیے تھے
اُن کو میں اپنی نادانی اور گمراہی سے مناسب طور پہ استعمال
میں نہ لا سکا۔ پہاڑی کی ابتدائی منزل سے اس کی بلند چوٹی
تک جا بجا چمن لہرا رہے تھے۔ مرادوں اور آرزوؤں کے گل
ہر طرف کھل رہے تھے اور بلا استثنا ہر ایک منزل میں خوشی اور
امید کے خوشنما درخت خوشگوار پھلوں سے جھکے ہوئے نظر آتے تھے

اور ایک عجیب راحت بخش نسیم ہر ایک چیز اور ہر ایک مقام میں تازگی اور شگفتگی بخشتی دکھائی دیتی تھی، قصہ کوتاہ ہر ایک جگہ خوشی و انبساط کے سامان تھے۔ اذن عام تھا کہ مسافر جس طرح چاہے استعمال کرے۔ کسی طرح کی روک ٹوک نہ تھی ان سے فائدہ اٹھانا محض مسافر کی عقل اور خواہش پر منحصر تھا مگر حیف کہ میں اس فرحت ناک منزل سے آنکھیں بند کیے چلا آیا میں یہی سمجھتا رہا کہ یہ فضا اور یہ بہار اسی طرح چلی جائے گی اور یہ پُر لطف اور مسرت ناک سامان منزل کے آخری حصہ تک ختم نہ ہوگا۔ مگر یہ میری کیسی غلطی تھی، اب کے عمر کے آخری مقام پر کھڑا ہو کر پچھلی طے کی ہوئی منزل پر نظر ڈالتا ہوں تو سوائے حسرت اور افسوس کے کچھ حاصل نہیں ہوتا عمر کا جو نہایت پُر فضا اور پرجوش حصہ تھا وہ گذر گیا۔ آگے کی طرف جو نظر ڈالتا ہوں تو سارے منظر وادی پُرخار معلوم ہوتے ہیں اور ایسی اونچی چڑھائی نظر آتی ہے کہ جس کا کامیابی کے ساتھ طے کرنا ایک موہوم سی اُمید ہے۔ سامنے کے منظر کی ڈراؤنی صورت اور طے کردہ منزل کی خوشبوئی اور بے نیل مرام چھوڑ آنے کے خیالات میرے دماغ کو ایسا پراگندہ کرتے ہیں کہ رہی سہی طاقت بھی سلب ہوتی معلوم ہوتی ہے۔

اے عزیزو! یہ مایوسی مجھے کیوں حاصل ہوئی اور کیوں میں حسب مراد دنیا سے بہرہ ور نہ ہوا؟ صرف اس سبب سے کہ میں نے

وقت کی قدر نہ جانی۔ ابتدائے عمر میں جب کہ میں کچھ کر سکتا تھا اور اپنی بہبودی کی بنیاد قائم کر سکتا تھا۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔ بدقسمتی سے کوئی رہبر یا ہادی ایسا نہ ملا جو مجھے سیدھے راستے پر ڈالتا۔ کوئی مربی یا محسن ایسا نصیب نہ ہوا جو میرے افعال و اعمال کو مناسب سمت کی طرف رجوع کرنے کی کوشش کرتا۔ اپنی ہی مرضی اور اپنی عقل سے کسی کامل رہبر یا کمپاس بغیر اپنی کشتی کو کھیتا رہا یہاں تک کہ ایک خطرناک چٹان پر آ کر بحر ہستی کی بے انتہا سطح پر جو نظر ڈالتا ہوں تو دیکھتا ہوں جن لوگوں نے دانشمندی اور قاعدے کی پابندی سے کام لیا اور وقت کو بے بہا سرمایہ سمجھا۔ وہ کیسے خوش و خرم و بامراد بحر ہستی سے عبور کر رہے ہیں، یوں تو کون سی چیز تھی جو وقت کی پرواز اور اس سے مستفید ہونے کی ضرورت نہ جتاتی۔ مگر میں ہی نادانی سے اس کا ایما نہ سمجھا۔ سالہا سال سورج صبح سے نکل کر اس نیلگوں چھت پر اپنا معمولی دورہ کرتا ہوا مغرب میں جا ڈوبا۔ مگر میں یوں ہی کاہلی سے بیٹھا ہوا اُس کے منہ کو تکتا رہا۔ اس کے قاعدے کی پابندی سے ذرا بھی سبق نہ لیا۔ چاند ہلال اور بدر ہو کر اپنے مقرر وقتوں پر ظاہر ہوتا رہا مگر مجھے اس کے نمونہ سے نصیحت حاصل نہ ہوئی۔ بہار اپنے معمولی وقتوں پر آئی اور عالمیوں کے واسطے خوان ایوان نعمت بچھا کر چلی گئی۔ مگر حیف میں یہ نہ سمجھا کہ یہ میری ہی عمر کے ایک سال

چلے جانے کا اشارہ کرتی ہے۔ کالے کالے مست بادل اپنے وقت پر آئے اور برس کے چلے گئے۔ بجلی نے آب وتاب کے ساتھ میری مندی ہوئی آنکھوں کو کھولنا چاہا۔ مگر صد افسوس میرے خفتہ دل نے بیداری حاصل نہ کی۔ رعد نے نہایت زور شور سے کڑک کر میرے کانوں کو کھولنا چا۔ مگر میرے کان پر جوں تک نہ چلی۔ ہوا تیز اور تند ٹھنڈی اور گرم سب قسم کی چلتی رہی مگر مجھے ذرا بھی ہوشیاری نہ ہوئی گھڑی ہر وقت میری میں رہی مجھے اپنی غمناک آواز سے ہر منٹ اور ہر سکنڈ وقت کی پرواز سے خبر دیتی رہی۔ مگر میں نہ سمجھا کہ یہ دراصل میری عمر رواں کے پاؤں کی آہٹ ہے۔ ہزاروں دفعہ جیب سے نکال کر دیکھا۔ کبھی چھ بجے کبھی دس بجے کبھی بارہ بجے۔ مگر حیف میں نہ سمجھا کہ یہ اپنی ہی عمر رفتہ کے نقش پا ہیں۔ ذوق کا سچا اور پُر فلسفہ شعر پڑھا مگر غور نہ کیا ؎

عمر رواں کو نہ گھڑیال کی صدا سمجھو   یہ عمر رفتہ کی اپنے صدائے پا سمجھو

بہت دفعہ ریلوے اسٹیشن پر گیا ٹرین کو جانے کے لیے تیار دیکھا، مسافر گٹھری باندھے سوار ہونے کے لیے تیاری کر رہے ہیں اور بہت سے اپنی منزل مقصود پر پہونچنے کے لیے خوشیاں منا رہے ہیں۔ اتنے میں انجن نے سیٹی دی۔ اور گھنٹی ٹن ٹن کر ریل یہ جا وہ جا۔ اب دیکھا تو نہ وہ ٹرین ہے نہ وہ

رونق، اسٹیشن پر ایک پژمردگی اور اُداسی کا عالم۔اس انقلاب
سے میرے دل میں ایک خفیہ چوٹ لگی۔ مگر حیف یہ نہ سمجھا کہ یہ ٹرین
زندگی کی رفتار سے خبر دیتی ہے۔جو لوگ کہ سوار ہوئے ہیں وہ
مسافر ملکِ عدم ہیں اور جو آتے ہیں وہ واردانِ ملکِ ہستی ہیں
اب جب کہ سمجھ آئی اور تجربہ ہوا تو وہ زمانہ رہا نہ وہ طاقت رہی
اب جب کہ کسی اسکول یا کالج کی عمارت کے پاس سے گزرتا ہوں
اور طالب علموں کے پڑھنے کی آواز میرے کان میں پڑتی ہے
تو کھڑا ہو جاتا ہوں اور آہ سرد بھر کر کہتا ہوں کہ" افسوس اب میں
دوبارہ لڑکا نہیں ہو سکتا" کیا اچھا ہو کہ میں اس تجربہ کے
ساتھ پھر زندگی کا از سرِ نو سفر شروع کروں۔
اب کیا ہو سکتا ہے۔بس اے طالب علمو! اور اے میرے
ملک کے ہوشیار اُمیدوارو! میں حسرت کے ساتھ تم سے مخاطب
ہوتا ہوں کہ میری تلف شدہ عمر تمھارے رستہ میں نوٹس بورڈ ہو
جس پر یہ درج ہو کہ

"خبردار اس طرف خطرہ ہے سنبھل کر چلو"
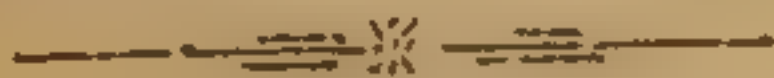
محمد حسین آزاد

شمس العلماء مولانا سید محمد حسین آزاد ۱۸۳۱ء میں پیدا ہوئے
اور ۱۹۱۰ء میں انتقال کیا۔

دہلی میں پیدا ہوئے ان کے والد مولوی محمد باقر نے ۱۸۳۶ء میں
اُردو کا پہلا اخبار بنام "اردو اخبار" جاری کیا۔ دہلی کالج سے
آزاد فارغ التحصیل ہو کر استاد ذوق کے شعر و شاعری میں شاگرد
ہو گئے۔ غدر کے بعد ۱۸۶۴ء میں بڑی مصیبتیں اٹھا کر لاہور پہونچے
وہاں اُردو فارسی کتابیں لکھنے پر مامور ہو گئے۔ آزاد نے لاہور میں
میجر فلر کی سرپرستی میں ایک نئے طرز کا ماہوار مشاعرہ قایم کیا
جس میں مختلف معاشرتی و اقتصادی عنوانوں پر نظم کہی جاتی تھی فلر
کے بعد ہال رائڈ صاحب اس کے سرپرست رہے اسی زمانہ میں آزاد
لاہور کے گورنمنٹ کالج میں عربی و فارسی کے پروفیسر ہو گئے۔

آزاد اُردو ادب میں بحیثیت صاحب طرز نثار کے زیادہ مشہور
ہیں بہ نسبت شاعر کے۔ وہ شاعر سے زیادہ نقاد ہیں۔ اور اس سے
بھی زیادہ انشا پرداز۔ یہ اُردو ادب کے بڑے محسنین میں سے ہیں۔
ان کا شاہ کار آب حیات ہے دیگر تصانیف نیرنگ خیال، سخندان پارس
دربار اکبری وغیرہ ان کی طرز تحریر کو بہت مقبولیت ہوئی۔ یہ وہ

خاص طرز تحریر ہے کہ اس کی نقل کوئی اب تک نہ کر سکا۔ ان کے انداز میں بلا کی سادگی
پرکاری۔ شوخی۔ شگفتگی اور انتہائی ادبیت ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ پانی
کی سی روانی ہے۔ اس کی تقلید ناممکن ہے یہ طرز تخیل کی بلند پروازی
اور تحریر کی پرکاری و شگفتگی کا نتیجہ ہے۔ وہ صحیح معنوں میں ایک بڑے ادیب
تھے اور زندگی بھر ایک مقرر۔ مصنف۔ ناقد۔ اور شاعر کی مختلف حیثیتوں
سے ادب اردو کی گراں بہا خدمت کرتے رہے۔ اُردو زبان میں ایلی گری
(رمزیہ) ان کے پہلے کسی نثار نے نہیں لکھی تھی اس کمی کو نیرنگ خیال
لکھ کر پورا کیا۔

شہرت عام وبقائے دوام کا دربار

تھوڑی دیر کے بعد ایک خورشید کلاہ آیا جس کو انبوہ کثیر ایرانی
تورانی ہندوستانیوں کے فرقہائے مختلفہ بیچ میں لیے آتا تھا۔ وہ
جس وقت آیا تو تمام اہل دربار کی نگاہیں اس کی طرف اٹھیں اور
رضامندیٔ عام کی ہوا چلی۔

تعجب یہ ہے کہ اکثر مسلمان اُس کو مسلمان سمجھتے تھے۔ ہندو اُسے
ہندو جانتے تھے۔ آتش پرستوں کو آتش پرست دکھائی دے رہا تھا۔
نصاریٰ اُس کو نصاریٰ سمجھتے تھے۔ مگر اُس کے سر تاج پر تمام سنسکرت
حروف لکھے تھے اس نے اپنے بعض ہم قوموں اور ہم مذہبوں کی

شکایت کر کے بدایونی پر خون کا دعویٰ کیا کہ اِس نے میری حیاتِ جاودانی کو خاک میں ملانا چاہا تھا وہ فتحیاب ہوتا اگر چند منصف مصنفوں کے ساتھ ابوالفضل اور فیضی کی تصنیف میری مسیحائی نہ کرتی۔ سب نے کہا نیت کا پھل ہے۔

اس کے بعد ایک اور بادشاہ آیا جو اپنی وضع سے ہندو راجہ معلوم ہوتا تھا وہ خود مخمور نشہ میں چور تھا۔ ایک عورت صاحب جمال اُس کا ہاتھ پکڑے آتی تھی اور جدھر جاہتی تھی پھر آتی تھی۔ وہ جو کچھ دیکھتا تھا اِس کے نورِ جمال سے دیکھتا تھا اور جو کچھ کہتا تھا اُسی کی زبان سے کہتا تھا۔ اِس پر بھی ہاتھ میں ایک جزو کاغذوں کا تھا اور کان پر قلم دھرا تھا۔ یہ سانگ دیکھ کر سب مسکرائے مگر چونکہ دولت اس کے ساتھ تھی اور اقبال آگے، آگے اہتمام کرتا آتا تھا۔ اس لیے بدمست بھی نہ ہوتا تھا۔ جب نشہ سے آنکھیں کھلتی تھیں تو کچھ لکھ بھی لیتا تھا، وہ جہانگیر تھا۔ اور بیگم نورجہاں تھی

شاہ جہاں بڑے جاہ و جلال سے آیا بہت سے مورّخ اس کے ساتھ کتابیں بغل میں لیے تھے۔ اور شاعر اس کے آگے آگے قصیدے پڑھتے آتے تھے۔ میر عمارت ان عمارتوں کے فوٹوگراف ہاتھ میں لیے تھے جو اس کے نام کے کتابے دکھاتی اور سینکڑوں برس کی راہ تک اس کا نام روشن دکھاتی تھیں اس کے آنے پر رضامندیٔ عام کا غلغلہ بلند ہوا چاہتا تھا، مگر ایک نوجوان آنکھوں سے اندھا چند بچوں کو

ساتھ لیے آیا کہ اپنی آنکھوں کا اور بچوں کے خون کا دعویٰ کرتا تھا، یہ شہریار شاہ جہاں کا چھوٹا بھائی تھا اور بچے اس کے بھتیجے تھے اس وقت وزیر اس کے آگے بڑھا اور کہا کہ جو کیا گیا بدنیتی اور خود غرضی سے نہیں کیا بلکہ خلق خدا کے امن اور ملک کا انتظام قایم رکھنے کو کیا بہرحال اُسے دربار میں جگہ ملی اور سلاطین چغتائیہ کے سلسلے میں معزز درجہ پر ممتاز تھا۔

ایک تاجدار آیا۔ کہ جُبّہ اور عمامہ سے وضعِ زاہدانہ رکھتا تھا۔ ایک ہاتھ سے تسبیح پھیرتا جاتا تھا۔ دوسرے ہاتھ میں جو فرد حساب تھی اس میں غرق تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ اس کی میزان کو پرتا لتا ہے۔ سب نے دیکھ کر کہا کہ اُنھیں خانقاہ میں پہونچانا چاہیے۔ اس دربار میں اس کا کچھ کام نہیں لیکن ایک ولایتی کہ بظاہر مقطع اور معقول نظر آتا تھا۔ وہ دونوں ہاتھ اٹھا کر آگے بڑھا۔ اور کہا کہ اے ارا کین دربار ہمارے ظلِ سبحانی نے اس کمبخت سلطنت کے لیے بھائی سے لے کر باپ تک کا لحاظ نہ کیا۔ اس پر بھی تمھارے اعتراض اُسے اس دربار میں جگہ نہ دینگے یہ لطیفہ اس نے اس مسخرے پن سے ادا کیا کہ سب مُسکرا دیے اور تجویز ہوئی کہ تیموری خاندان کے سب سے اخیر میں انھیں بھی جگہ دے دو۔ معلوم ہوا کہ وہ عالمگیر بادشاہ اور ساتھ اس کے نعمت خان عالی تھا۔ اس کے ساتھ ہی ایک مینڈا جوان دکھنی وضع جنگ کے ہتھیار لگائے راجگی کے سکے تمغے سے سجا ہوا آیا۔ اس کی طرف لوگ متوجہ نہ ہوئے

بلکہ عالمگیر کچھ کہنا بھی چاہتا تھا مگر وہ کُرسی کھینچ کر اُس کے سامنے بیٹھ گیا اور بولا۔ کہ صاحب ہمت کو جگہ دو یا نہ دو وہ آپ پیدا کر لیتا ہے۔ یہ شیوا جی تھا جس سے مرہٹہ خاندان کی بنیاد قایم ہوئی۔

تھوڑی دیر کے بعد دُور سے گانے بجانے کی آواز آئی بعد اُس کے ایک بادشاہ آیا اُس کی وضع ہندوستانی تھی۔ مصنفوں اور مؤرخوں میں سے کوئی اس کے ساتھ نہ تھا۔ البتہ چند اشخاص تھے کہ کوئی اُن میں گویا اور کوئی بھانڈ کوئی مسخرا نظر آتا تھا۔ یہ سب گھبرائے ہوے آ رہے تھے۔ کیونکہ ایک ولایتی دلاور ان کے پیچھے پیچھے شمشیر برہنہ علم کیے تھا۔ اُس کی اصفہانی تلوار سے لہو کی بوندیں ٹپکتی تھیں مخمل رومی کی کُلاہ تھی۔ جس پر ہندوستان کا تاج شاہی نصب تھا اور اسپ بخارائی زیر ران تھا۔ وہ ہندوستانی وضع بادشاہ محمد شاہ تھا۔ اُسے دیکھتے ہی سب نے کہا کہ نکالو نکالو ان کا یہاں کچھ کام نہیں چنانچہ وہ فوراً دوسرے دروازے سے نکالے گئے۔ ولایتی مذکور نادر شاہ تھا۔ جس نے سرحد روم سے بخارا تک فتح کر کے تاج ہندوستان سر پر رکھا تھا اُسے چنگیز خاں کے پاس جگہ مل گئی۔

تھوڑی دیر ہوئی تھی جو غول ہندوستانیوں کا پیدا ہوا۔ ان لوگوں میں بھی کوئی مرقع بغل میں دبائے تھا۔ کوئی گلدستہ ہاتھ میں لیے تھا۔ اُنھیں دیکھ کر آپ ہی خوش ہوتے تھے۔ اور وجد کر کے اپنے اشعار پڑھتے۔ یہ ہندوستانی شاعر تھے۔ چنانچہ چند اشخاص انتخاب

ہوے۔ اُن میں ایک شخص کو دیکھا کہ جب بات کرتا تھا اس کے منہ سے رنگا رنگ کے پھول جھڑتے تھے۔ لوگ ساتھ دامن پھیلائے تھے۔ مگر بعض پھولوں میں کانٹے ایسے ہوتے تھے کہ لوگوں کے کپڑے پھٹے جاتے تھے پھر بھی مشتاق زمین پر گرنے نہ دیتے تھے۔ کوئی نہ کوئی اٹھا ہی لیتا تھا وہ مرزا رفیع سوداؔ تھے۔

میرؔ بد دماغی اور بے پرواہی سے آنکھ اٹھا کر نہ دیکھتے تھے۔ شعر پڑھتے تھے اور منہ پھیر لیتے تھے۔ دردؔ کی آواز دردناک دنیا کی بے بقائی سے جی بیزار کیے دیتی تھی۔ میر حسنؔ اپنی سحر بیانی سے پرستان کی تصویر کھینچتے تھے۔ میر انشاء اللہ خاں قدم قدم پر نیا بہروپ دکھاتے تھے۔ دم میں عالم ذی وقار متقی بہ بیزگار دم میں ڈاڑھی چٹ نیگ کا سونٹا کندھے پر۔

جراتؔ کو اگر کوئی خاطر میں نہ لاتا تھا۔ جب وہ میٹھی آواز سے ایک تان اڑاتا تھا تو سب کے سر ہل جاتے تھے۔ ناسخؔ کی گلکاری چشم آشنا معلوم ہوتی اور اکثر جگہ قلم کاری اس کی عینک کی محتاج تھی۔ مگر آتشؔ کی آتش نابی اُسے جلائے بغیر نہ چھوڑتی تھی۔ مومنؔ کم سخن تھے مگر جب کچھ کہتے تھے تو جراتؔ کی طرف دیکھتے جاتے تھے۔ ایک پیر مرد دیرینہ سال محمد شاہی دربار کا لباس جامہ پہنے کھڑکی دار پگڑی باندھے جریب ٹیکتے آتے تھے۔ مگر ایک لکھنؤ کے بانکے پیچھے پیچھے گالیاں دیتے تھے۔ بانکے صاحب ضرور ان سے دست و گریبان ہو جاتے لیکن چار

خاکسار اور پانچواں تاجدار اُن کے ساتھ تھا۔ یہ بجا لیتے تھے۔ بڑھے میر امن دہلوی چار درویش کے مصنف تھے اور بانکے صاحب مرزا سرور فسانہ عجائب والے تھے۔ ذوق کے آنے پر پسند عام کے عطرسے دربار مہک گیا۔ انھوں نے اندر آکر شاگردانہ طور پر سب کو سلام کیا۔ سودا نے اُٹھ کر ملک الشعرائی کا تاج اُن کے سر پر رکھ دیا۔ غالب اگرچہ سب سے پیچھے تھے۔ پر کسی سے نیچے نہ تھے بڑی دھوم دھام سے آئے اور ایک نقارہ اس زور سے بجایا کہ سب کے کان گنگ کر دیے۔ کوئی سمجھا اور کوئی نہ سمجھا، مگر واہ واہ اور سبحان اللہ کرتے رہ گئے۔

اب میں نے دیکھا کہ فقط ایک کرسی خالی رہ گئی ہے۔ بس اتنے میں آواز آئی کہ آزاد کو بلاؤ ساتھ ہی آواز آئی کہ شاید وہ اس جرگہ میں بیٹھنا قبول نہ کرے۔ مگر وہیں پھر کوئی بولا کہ اُسے جن لوگوں میں بٹھا دوگے، بیٹھ جائے گا۔ اتنے میں چند اشخاص نے غل مچایا کہ اس کے قلم نے ایک جہان سے لڑائی باندھ رکھی ہے۔ اسے دربار شہرت میں جگہ نہ دینی چاہیے۔ اس مقدمہ پر قیل و قال شروع ہوئی میں چاہتا تھا کہ نقاب چہرے سے اُلٹ کر آگے بڑھوں اور کچھ بولوں کہ میرے ہادی ہمدم یعنی فرشتۂ رحمت نے ہاتھ پکڑ لیا۔ اور چپکے سے کہا کہ ابھی مصلحت نہیں۔ اتنے میں آنکھ کھل گئی میں اس جھگڑے کو بھی بھول گیا۔ اور خدا کا شکر کیا کہ بلا سے دربار میں کرسی ملی یا نہ ملی مُردوں سے زندوں میں تو آیا۔

خان بہادر شمس العلماء مولوی ذکاء اللہ

پیدائش سنہ ۱۸۳۲ء وفات سنہ ۱۹۱۰ء

مولوی ذکاء اللہ نے ابتدائی تعلیم اپنے والد اور دیگر فاضلوں سے دہلی میں حاصل کی۔ وہیں کے کالج سے فارغ التحصیل ہو کر ریاضی کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ پھر آگرہ کالج میں فارسی اور اردو کے پروفیسر ہوئے اس کے بعد کچھ دنوں تک ڈپٹی انسپکٹر مدارس رہ کر میور سنٹرل کالج الہ آباد میں عربی فارسی کے پروفیسر ۲۶ سال رہے۔

آپ نے اردو زبان کی بڑی خدمت کی تہذیب الاخلاق انسٹیٹیوٹ گزٹ میں مضامین لکھتے رہے۔ آپ ڈیڑھ سو کتابوں کے مصنف ہیں۔ ۸۲ ریاضی کتابیں ہیں ان کے علاوہ ادب اخلاق طبعیات سیاست مدن و جغرافیہ و تاریخ کی ہیں۔

آپ کا طرز تحریر سلیس، و صاف ہے عبارت آرائی اور تصنع سے بالکل پاک ہے فقرات میں تحقیق کا شوق اور خیالات میں فلسفیانہ رنگ ہے۔ علوم کی کتابوں میں کہیں کہیں عبارت خشک و بے مزہ معلوم ہوتی ہے۔ حالی نے آپ کی بابت سچ کہا ہے کہ "مولوی ذکاء اللہ کا دماغ ایک بنیے کی دکان ہے۔ جس میں ہر قسم کی جنس موجود رہتی ہے۔"

کتب کا مُطالعہ

مطالعہ تنہائی و عزلت میں خوشی بخشتا ہے۔ گفتگو و تقریر میں حسن بیان پیدا کرتا ہے۔ معاملات کے فیصلہ کرنے اور مقدمات میں رائے دینے کی قابلیت بڑھتی ہے۔ گو معاملات و مقدمات کا تیز و چالاک آدمی بھی فیصلہ کر دیتے ہیں مگر مقدمات اور منصوبوں کی ترتیب اور عام اصلاح کی تدابیر جیسی کہ چاہیے، اچھے عالم و فاضل ہی کرتے ہیں۔

تم اس واسطے نہ پڑھو کہ لوگوں کے خلاف باتیں کہیں گے اور ان کی باتوں کی تردید کریں گے یا سب باتوں کو یقین اور تسلیم کریں گے یا ہم خود بہت سی باتیں بنائیں گے۔ بلکہ پڑھنے سے مقصد اعظم یہ ہو کہ ہم لوگوں کی باتوں کو تولیں گے اور سوچیں گے۔ پھر جو عمل کرنے کے قابل ہوں گی اُن پر عمل کریں گے بعض کتابوں کا صرف مزہ چکھا جاتا ہے۔ بعض بالکل نگلی جاتی ہیں یعنی کُل پڑھی جاتی ہیں مگر بے توجہی اور بے غوری سے۔ بہت تھوڑی کتابیں ہیں، جو چبا چبا کر ہضم کی جاتی ہیں۔ کتابوں کے انتخابات سے جو کتابیں بنتی ہیں، اُن کا حال آبِ مقطر کا سا ہے۔

آدمی پڑھنے سے کامل بنتا ہے۔ اس سے تقریر شستہ تحریر چست و درست ہو جاتی ہے۔ تاریخ کا مطالعہ آدمی کو دانشمند و تجربہ کار

بنا دیتا ہے۔ نظم کا طبیعت میں جودت پیدا کرتا ہے۔ علوم ریاضیہ کا طبیعت کو ذکی بناتا ہے اور علوم طبعیہ کا ذہانت کو عمیق، علم اخلاق کا سنجیدہ ومتین۔ منطق، علم بلاغت وفصاحت کا مباحثہ ومناظرہ کی قابلیت پیدا کرتا ہے۔ غرض مطالعے کا اثر ضرور انسان کے اوضاع واطوار وکردار پر ہوتا ہے۔

انسان کے امراض جسمانی کے جیسے خاص علاج ہیں، ایسے ہی امراض ذہنی کے بھی مخصوص علاج ہیں۔ سینہ وشش کا علاج شکار، معدے کا علاج سہج سہج قدم قدم چلنا۔ دماغ کا علاج گھوڑے پر سوار ہونا۔ علی ہذا القیاس اور علاج ہیں۔ اسی طرح اگر ذہن میں آوارگی و پریشانی ہو، تو علوم ریاضیہ کا مطالعہ اس کا علاج ہے جو اس کے ذہن کی پریشانی کھو دے گا۔ اگر ذہن بے تمیز ہے، کہ وہ دو چیزوں میں تمیز اور فرق نہیں کر سکتا تو حکمت وفلسفہ اس کا علاج ہے۔ اگر ذہن ایسا ہے کہ وہ ایک بات کے ثبوت سے دوسری بات کی توضیح نہیں کر سکتا تو قانون دانوں کے فیصلہ جات کا پڑھنا اس کی دوا ہے غرض امراض ذہنی کے ایسے ہی علاج ہوتے ہیں۔

مطالعۂ کتب میں تو عاقلوں سے باتیں ہوتی ہیں اور کاروبار زندگی کے معاملات میں بیوقوفوں سے۔ جو مطالعۂ کتب ہمارے کاروبار زندگی میں کام نہیں آتا، اس کو بھی بیکار نہ جانو۔ کیونکہ وہ ہماری عقل وفہم کو درست کرتا ہے۔ مطالعہ ہی ایک ایسا فن ہے جو

اور فنون کے استعمال کو سکھاتا ہے۔

دانشمندوں کے کلام کے مطالعے پر نوجوان اپنے دماغ کو متوجہ کرے گا تو ابتدا میں مسرت حاصل ہوگی۔ پھر دانائی کے ساتھ مواصلت۔ کسی مطالعہ سے مضرت کبھی نہیں ہوتی بلکہ ہر مطالعے کے ساتھ مسرت ہے۔ جو لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ علم کے پیچھے پڑنے سے صحت کو مضرت پہونچتی ہے، وہ بڑی غلطی کرتے ہیں۔ مشاہدہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مطالعہ کرنے والوں کی عمریں بھی ایسی ہی ہوتی ہیں جیسی اور پیشے والوں کی۔ اس مشاہدے کی صداقت کی شہادت تاریخ بھی دیتی ہے۔ طالب علموں کی باقاعدہ اور آرام کی زیست صحت و تندرستی کو زیادہ کرتی ہے۔ اور بہت سی تکالیف اور امراض سے بچاتی ہے۔ مگر اس کے ساتھ یہ شرط ضرور ہے کہ وہ اپنی فضول حرارت جسمانی کو معتدل ورزش جسمانی سے کم کرتا رہے اور جسم کو کاہلی کا عادی نہ بنائے۔

آدمی اپنے وقت کاٹنے کے لیے حقہ پیتے ہیں، ہلاس سونگھتے ہیں اور اس سے مسرور ہوتے ہیں، اب اس سے سمجھ لینا چاہیے کہ جو لوگ کسی فن یا علم کی کتابوں کا مطالعہ کرتے ان کا وقت کیسا خوشی سے کٹتا ہوگا، ابتدا میں جو اس کے اندر کچھ محنت معلوم ہوتی ہے، وہ آگے جا کر تفریح طبیعت ہو جاتی ہے۔

جب آسمان پر چاندنی کا لمپ روشن ہو تو یہ وقت

تیرے مطالعے کے لئے اچھا ہے۔ کہ تیری کتاب کے صفحوں پر چاندنی پڑے اور تو اس میں باریک اور تاریک معانی کو دیکھے۔ اور چاند اور پرستاروں کی سحر کاری کو سمجھے۔

نفس کے واسطے مطالعہ ایسا ہے جیسے جسم کے واسطے ورزش ورزش جسمانی سے جسمانی تنومندی اور تندرستی حاصل ہوتی ہے۔ مطالعے سے نیکی جو روحانی صحت ہے ہاتھ آتی ہے۔ ورزش سے جو خاص جسم کی تناوری کے لیے کی جائے کچھ تکان ہوتی ہے۔ اسی طرح مطالعے سے بھی جو فقط نکوکاری کے واسطے کیا جائے کچھ تکلیف ہوتی ہے مگر جب کہیں پسندیدہ کام سے مسرت پیدا ہوتی ہے تو اس کی تکلیف اور تکان کی پرواہ نہیں ہوتی۔ شکار کھیلنے سے مسرت و صحت ایسی حاصل ہوتی ہے کہ اس کی محنت راحت معلوم ہوا کرتی ہے۔ ایسے ہی تمثیلات اور نقل وحکایات کے اور نصائح کے مطالع سے انبساط و صحت روحانی حاصل ہوتی ہے اور اس کی محنت کچھ نہیں معلوم ہوتی۔

بعض مطالعہ کرنے والے ایسے نادان ہوتے ہیں کہ متقدمین کی وہ کتابیں مطالعے میں رکھتے ہیں، جن کا بہت سا حصہ ان کی سمجھ میں نہیں آتا لیکن جہاں کہیں کوئی مضمون ان کی سمجھ میں آجاتا ہے تو خوشی کے مارے اچھل پڑتے ہیں۔ اور کپڑوں میں پھولے نہیں سماتے۔ لیکن یہ نہیں سمجھتے کہ دس باتوں میں سے ایک سمجھ میں

آئی تو کیا آئی۔

خودشناسی

اپنی لیاقت کا اندازہ کرنے میں انسان کی رائے بڑی خطا کرتی ہے۔ وہ نہیں سمجھتا کہ مجھے اپنا علم جتنا زیادہ ہوگا، اتنا ہی خطاؤں، گناہوں اور حماقتوں سے بچوں گا۔ میری خود شناسی جتنی زیادہ ہوگی، اتنی ہی خداشناسی بڑھے گی اور اس سے میرے خیال و اشغال مجموعۂ مسرت بن جائیں گے۔ مشکل ہے کہ آدمی خودشناس ہو۔ کیونکہ خودپسندی خود شناسی کو پاس نہیں پھٹکنے دیتی۔ جہاں دیکھو وہاں یہی نظر آتا ہے کہ آدمی اپنی نیکیوں کی جتنی وہ خود قدر کرتا ہے، اتنی کوئی اور نہیں کرتا۔ وہ اپنی خوبیوں کی ایسی تعریف کرتا ہے کہ کوئی اس کا خیرخواہ بھی اُن کی اتنی ستائش نہیں کرے گا۔ یہ خودپسندی جو اس کے دل میں خیالی نیکیوں کو پیدا کرتی ہے۔ اس کو لوگ ریاکاری اور تعریف و اعتبار کی جعلسازی جانتے ہیں۔ لیکن حقیقت میں یہ بات نہیں۔ کیونکہ جو اس طرح اپنی شہرت پھیلاتے ہیں پہلے خود فریب اور دھوکا کھاتے ہیں۔ پھر ان کے ساتھ اور لوگ بھی فریب میں آجاتے ہیں۔ وہ دانستہ اوروں کو فریب نہیں دیتے انسان کو اپنی ذات سے ایسی محبت ہے کہ اسے اپنے عیبوں

اور بُرائیوں کو دیکھنا نہایت مشکل ہے۔

انسان اپنے میں اس نیکی کی عادت کا یقین کرتا ہے جو اس نے ساری عمر میں صرف ایک دفعہ کی ہو۔ مثلاً کسی کنجوس نے ایک دفعہ کچھ روپے خرچ کرکے اپنے کسی دوست کو قید سے بچا لیا ہو، تو وہ صرف ایک دفعہ کے سلوک کو یہ جانے گا کہ میری عادت ہے کہ میں دوستوں کے ساتھ دولت سے سلوک کیا کرتا ہوں، جب کوئی اس بخیل پر لعنت ملامت کرے گا تو وہ اپنی وہی فیاضی کی مثال پیش کرکے اپنے دل کو راضی کرلے گا۔ جیسے بعض شیشوں کی خاصیت ہوتی ہے کہ اگر ان کے ایک سرے کو آنکھ سے لگاؤ تو وہ چیزوں کو بڑا کرکے دکھاتے ہیں اور دوسرے کو لگاؤ، تو چھوٹا۔ بس ایسے ہی مغالطوں سے بُرائیاں اور چھوٹی نیکیاں بڑی ہو جاتی ہیں۔

بہت سے آدمی ایسے ہوتے ہیں کہ اپنے میں وہ نیکیاں سمجھنے لگتے ہیں۔ جو اوروں کو کرنے کے لیے سمجھاتے ہیں۔ فیاضی، اعتدال اور ایمانداری کا بیان جب وہ فصاحت سے کرتے ہیں تو جانتے ہیں کہ یہ نیکیاں ہم میں خود پیدا ہو گئیں۔ اس غلطی میں اکثر وہ لوگ پڑتے ہیں جن کا ہیشہ نیکیوں کے سمجھانے کا ہے۔ وہ فقط اس بیان کرنے پر اکتفا کرکے اپنے چال چلن پر متوجہ نہیں ہوتے کہ وہ کیسا ہے۔ ایسے آدمیوں کا بھی ایک گروہ ہے کہ وہ اپنے بُرے

چال چلن کو مذہبی پیمانے سے نہیں ناپتے بلکہ اور لوگوں کے اطوار سے اگر وہ خراب تر ہیں اور یہ خراب، تو اپنے تئیں نیک جانتے ہیں۔ اور اگر وہ دس گناہ کرتے ہیں اور یہ نو، تو اپنے تئیں بڑا نیک سمجھتے ہیں۔ غرض یوں ہم اپنے تئیں آپ دھوکا دیتے ہیں اور اپنے تئیں نہیں جانتے۔ سنیکا کا قول ہے کہ موت اس شخص پر بڑی سخت ہوتی ہے جو اپنے تئیں نہیں جانتا اور بہت سے لوگ اس کو جانتے ہیں۔ آدمیوں کو چاہیے کہ اپنے تئیں[1] جانیں جس پر تمام نیکیاں موقوف ہیں۔"

---

[1] تئیں آجکل رائج نہیں ہے۔

شمس العلماء ڈاکٹر نذیر احمد

آپ ۱۸۳۶ء میں ریہڑ ضلع بجنور میں پیدا ہوئے اور ۱۹۱۲ء میں وفات پائی۔ بچپن میں اپنے والد کے ساتھ دہلی چلے آئے اور وہیں پڑھا پہلے فارسی، عربی اپنے والد سے پڑھی ۱۸۴۵ء میں دہلی کالج میں داخل ہوئے ۱۸۵۳ء میں فارغ التحصیل ہو کر نکل آئے گورنمنٹ کے حکم سے تعزیرات ہند قانون انکم ٹیکس کا ترجمہ اُردو میں کیا اس کے صلہ میں تحصیل دار ہوئے پھر قانونِ شہادت وغیرہ کا ترجمہ کر کے ڈپٹی کلکٹر ہو گئے۔

فارسی عربی کے علاوہ آپ کو سنسکرت بھی آتی تھی حیدرآباد جا کر آپ نے تلنگی زبان بھی سیکھی۔

آپ کے طرزِ تحریر میں سادگی اور سلاست بہت زیادہ پائی جاتی ہے فارسی مثالیں اور عربی الفاظ اور فقروں کو بھی مصرف میں لاتے ہیں۔ آپ کی عبارت میں آزاد کی سی رنگینی اور شوخی نہیں ہے لیکن اِن کی زبان دہلی کی ٹکسالی زبان ہے۔ آپ اُردو کے سب سے پہلے ناول نگار قرار دیے جاتے ہیں۔ آپ کی ناولوں میں روزمرہ کی صاف ستھری زبان بول چال کا رنگ لیے ہے۔ آپ کے بعد راشد الخیری اور مرزا فرحت اللہ بیگ نے اُس طرز کو بدستور قائم رکھا۔ آپ کو ٹھیٹھ محاوروں کے استعمال کا بہت شوق تھا اور بعض اوقات سنجیدگی سے گرے ہوئے محاورے لکھ جاتے ہیں۔ آپ غریب گھر کی زندگی کا چربہ اُتارتے تھے۔

ابن الوقت کی تقریب

آج کل کا سا زمانہ ہوتا تو کانوں کان کسی کو خبر بھی نہ ہوتی،

ابن الوقت کی تشہیر کی بڑی وجہ یہ ہوئی کہ اُس نے ایسے وقت میں انگریزی وضع اختیار کی جبکہ انگریزی پڑھنا کفر اور انگریزی چیزوں کا استعمال ارتداد سمجھا جاتا تھا، یہ تو ہماری آنکھوں کی دیکھی باتیں ہیں کہ ریل میں بےضرورت کوئی بھلا مانس چرٹ پیتا تو جان پہچان والوں سے چراتا چھپاتا ایک دوست کہیں باہر بندوبست میں نوکر تھے اور جانچ پڑتال کے لیے ان کو کھیت کھیت پھرنا پڑتا تھا، ہندوستانی جوتی اس رہڑ میں کیا ٹھہرتی ناچار انگریزی بوٹ پہننے لگے تھے مگر دو چار دن کے لیے دہلی آتے تو گھر میں سے کبھی پڑے ہوئے پھٹے پرانے لتیڑے ڈھونڈھ کر پاؤں میں ہلگا لیتے، تب کہیں گھر سے باہر نکلتے، دہلی کالج اُن دنوں بڑے زوروں پر تھا ملکی لاٹ آئے اور تمام درسگاہوں کو دیکھتے بھالتے پھرے قدردانی ہو تو ایسی ہو کہ جس جماعت میں جاتے مدرس سے ہاتھ ملاتے، بڑے مولوی صاحب نے طوعًا وکرہًا بادلِ ناخواستہ آدھا مصافحہ کیا تو سہی مگر اُس ہاتھ کو عضوِ نجس کی طرح الگ تھلگ لیے رہے، لاٹ صاحب کا منہ موڑنا تھا کہ بہت مبالغے کے ساتھ (انگریزی صابون سے نہیں بلکہ مٹی سے رگڑ رگڑ کر اُس ہاتھ کو دھو ڈالا، ابن الوقت جیسے ملامتی نہیں تو اُس کے ہمخیال خال خال اور بھی چند مسلمان تھے جن کے لڑکے اِکا دکا

دہلی کالج میں انگریزی پڑھتے تھے۔ اِن لڑکوں میں سے اگر کوئی عربی فارسی جماعتوں میں آنکلتا اور آنکھ بچا کر پانی پی لیتا تو مولوی لوگ مٹکے توڑ واڈالتے۔ ہرچند تعصبات لغو کی کوئی حد نہ تھی تاہم ہم انگریزی حکومت جیسے اُن دنوں کی مطمئن تھی آیندہ تابقائے سلطنت انگریزوں کو خواب میں بھی نصیب ہونے والی نہیں، لوگوں کو مفید و مضر کے تفرقے بُرے بھلے کے امتیاز کا سلیقہ نہ تھا۔ سرکار بہ منزلہ مہربان باپ کے تھی اور بھولی بھالی رعیت بجائے معصوم بچوں کے انگریزی کا پڑھنا ہمارے بھائی بندوں کے لیے کچھ ایسا ناسزاوار ہوا جیسا آدم اور اس کی نسل کے حق میں گیہوں کا کھا لینا، گئے تھے نماز معاف کرانے اُلٹے روزے اور گلے پڑے، انگریزی زبان، انگریزی وضع کو اوڑھنا بچھونا بنایا تھا، اِس غرض سے کہ انگریزوں کے ساتھ لگاوٹ ہو۔ مگر دیکھتے ہیں تو لگاوٹ کے عوض رکاوٹ ہے، اور اختلاط کی جگہ نفرت، حاکم محکوم میں کشیدگی ہے کہ بڑھتی چلی جاتی ہے۔ دریا میں رہنا مگرمچھ سے بیر، دیکھیں آخر کار یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔

ذرا مشکل ہے اس بات کا پتہ لگے گا کہ کون سی چیز ابن الوقت کو انگریزی وضع کے اختیار کرنے کی محرک ہوئی۔ وہ ایک ایسے خوش حال اور شریف خاندان کا آدمی تھا جس کے لوگ پاسِ وضع کو شرطِ شرافت سمجھتے تھے، شرف علم اِن میں متوارث تھا، اِس خاندان کے لوگ بعض طبیب تھے بعض مدرس (سرکاری نہیں) بعض مفتی، بعض واعظ

بعض حافظ، بعض صاحب سجادہ طریقت، الغرض ع

"این خانہ تمام آفتاب است"

لوگ سب نہیں تو اکثر وَ لِلْاَکْثَرِ حُکْمُ الْکُلِّ ہر طرح کے ہنروں سے متصف، اور ہر طرح کے کمالات سے متجلی تھے، شاہی قلعہ ان سب کے معاش کا متکفل تھا، انگریزوں کے ساتھ ان لوگوں کو اگر تعلق تھا تو اسی قدر کہ انگریزی عملداری میں رہتے تھے وہ بھی اپنے زعم میں نہیں۔ ابن الوقت کے کالج میں داخل ہونے کا بھی یہ سبب ہوا کہ شہر کے مشاہیر جو عربی فارسی میں مستند تھے سرکار نے چن چن کر سب کو پابند مدرسہ کر لیا تھا۔ پس ابن الوقت مدرسے میں داخل کیا گیا، نہ اس غرض سے کہ مدرسے کی طالب علمی کو ذریعۂ معاش قرار دے بلکہ صرف اس لیے کہ اُس کی عربی فارسی ٹکسالی ہو، ابن الوقت اپنے وقت کے منتخب نہیں تو بھی اچھے طلبا میں شمار کیا جاتا تھا، مناسبت طبیعت کی وجہ سے اُس کے بعض ہم جماعت اِس سے خاص خاص چیزوں میں اچھے بھی تھے مگر اُس کے مجموعی نمبر کبھی کسی سے ہیٹے نہیں رہے۔ وجہ یہ تھی کہ جس قدر وہ ریاضی میں کچا تھا، تاریخ، جغرافیہ، سیاست مدن اخلاق وغیرہ سے جن کا اُس کو شوق تھا اس خامی کی تلافی بخوبی ہوتی رہتی تھی مدرسے کی ساری پڑھائی میں اس کی پسند کی چیز تاریخ تھی، کسی ملک اور کسی وقت کی کیوں نہ ہو، اس کی طبیعت عام باتوں میں خوب لگتی تھی، جواب مضمون پر ہر سال ایک نقرئی تمغہ ملا کرتا تھا، چھ برس ابن الوقت مدرسے میں رہا

کسی برس اُس نے وہ تمغہ انگریزی، عربی، فارسی، سنسکرت میں کسی کو لینے ہی نہ دیا۔ جب موقع ملتا ابن الوقت پُرانی دلی کے کھنڈروں میں تعطیل کے دنوں کو ضرور صرف کرتا۔ غیر ملک کے لوگ تجارت، سیاحت یا کسی دوسری ضرورت سے شہر میں آ نکلتے تو ابن الوقت اد بدا کران سے ملتا۔ اور اُن کے ملک کے حالات و عادات کی تفتیش کرتا۔ اُس کا حافظہ معلومات تاریخی کے ذخیرے سے اس قدر معمور تھا کہ وہ معمولی بات چیت میں واقعات زمانہ گذشتہ سے اکثر استشہاد کیا کرتا۔ ایک بار اُس نے باتوں ہی باتوں میں سلیٹ پر اپنی یادداشت سے ایشیا کا نقشہ کھینچا اور مشہور شہروں اور پہاڑوں اور دریاؤں کے مواقع اس میں ثبت کیے۔ پھر جو ملا کر دیکھا تو بہ تفاوت یسیر اکثر صحیح، وہ دنیا کی قوموں اور ذاتوں اور رسموں کی ٹوہ میں لگا رہتا، مذہب کے بارے میں اُس کی معلومات کتاب الملل والنحل سے کہیں زیادہ تھی، جب کوئی نئی کتاب جماعت میں شروع ہوتی تو اُس کا پہلا سوال یہ ہوتا، کہ اس کا مصنف کون تھا؟ کہاں کا رہنے والا تھا؟ کس زمانہ میں تھا؟ کس سے اس نے پڑھا؟ اُس کے معاصر کون کون تھے؟ اُس کے وقائع عمری میں کون کون سی بات قابلِ یادگار ہے؟ تعزز اور ترفع ابن الوقت کے مزاج میں اس درجے کا تھا کہ لوگ اُس کی خودداری کو بہ منجر کبر خیال کرتے تھے، دوسرے کا احسان اُٹھانے کی اُس کو سخت عار تھی، یہاں تک کہ اُستاد کے سوائے وہ کسی ہم جماعت سے پوچھنے تک میں مضائقہ کرتا، وہ ہمیشہ ایسے مدرس کی جماعت میں رہنا چاہتا جس کی

پرنسپل زیادہ عزّت کرتا ہو، اور اسی سبب سے وہ کئی بار عربی سے فارسی اور فارسی سے عربی میں بدلتا پھرا، ابن الوقت اپنی رائے بہ دیر قایم کرتا تھا، مگر جب ایک بار قایم کر لیتا اُسے بدلنے کی گویا اس کو قسم تھی، اُس کی یہ رائے کسی سے مخفی نہ تھی کہ کسی قوم میں سلطنت کا ہونا اس بات کی کافی دلیل ہے، کہ اُس قوم کے مراسم، عادات، خیالات، افعال، اقوال، حرکات، سکنات، یعنی کل حالات فرداً فرداً نہیں تو مجتمعاً ضرور بہتر ہیں، وہ نہایت وثوق کے ساتھ کھلم کھلا کہا کرتا کہ سلطنت ایک ضروری اور لازمی نتیجہ ہے قوم کی برتری کا، انگریزی نوکری کی نہ اس کو ضرورت تھی اور نہ طلب، پس وہ اپنی اس رائے کی بنیاد پر بے غرضانہ ہر انگریز کو اگرچہ گھٹیا بے حیثیت یوریشین ہی کیوں نہ ہو بڑی وقعت کی نظر سے دیکھتا اس خیال کے آدمی کو خصوصاً جبکہ وہ کالج میں داخل بھی تھا، انگریزی خواں ہونا چاہیے تھا اور اُس کے دل میں انگریزی پڑھنے تقاضا بھی ضرور پیدا ہوتا ہوگا، مگر باپ کے وفات پا جانے سے نواب معشوق محل بیگم کی سرکار کی موروثی مختاری اس کے سر پڑی، ہر چند اس کے بڑے بھائی ایک اور بھی تھے اور چاہتے تو مختاری کو سنبھال لیتے مگر اُن کو اپنے اوراد و وظائف سے مطلق فرصت نہ تھی اور وہ آدمی تھے بھی وحشت زدہ سے۔ ناچار ابن الوقت کو اس سرکار کا بڑا بھاری کارخانہ سنبھالنا پڑا، چند روز تک ابن الوقت نے یوں بھی کر کے دیکھا، کہ خارج از اوقات مدرسہ قلعے کا کام دیکھتا بھالتا، بیگم کی طرف سے خدانخواستہ کسی طرح کی سختی نہ تھی، مگر

خود ابن الوقت دیکھتا تھا کہ اس کا وقت دونوں کاموں کے لیے مساعدت نہیں کرتا، پس اُس نے مجبور ہو کر مدرسے سے اپنا نام کٹوا لیا، پھر بھی وہ تاریخ وغیرہ اپنے ڈھب کی کتابوں کے لیے شاہی کتب خانے اور اخباروں کے واسطے مطبع سلطانی کے بلا ناغہ حاضر باشوں میں تھا، تاریخ اور اخبار کی اُس کو ایسی دھت تھی کہ وہ کبھی ان چیزوں سے ملول ہوتا ہی نہ تھا۔

ابن الوقت نے مدرسہ چھوڑا تو گو وہ عربی فارسی جماعتوں کا طالب علم تھا تاہم، اُس کو مشق کے لیے ریاضی کی انگریزی کتابوں سے مدد لینے کی ہمیشہ ضرورت واقع ہوا کرتی تھی، ناچار اس کو انگریزی کے حروف پہچاننے پڑے، طبیعت تھی اخاذ حرفوں کا پہچاننا تھا، کہ چند روز میں اٹکل سے سوالات کا طریقۂ حل سمجھنے لگا، اور یوں ریاضی کی۔دکن میں اس کی انگریزی کی استعداد ترقی کرتی گئی، جب وہ انگریزی وضع اختیار کر کے اپنے پندار میں پورا صاحب لوگ بن گیا اُس زمانے میں بھی وہ انگریزی سمجھ تو کافی لیتا تھا مگر زبان انگریزی میں بے تکلف بات چیت کرنے کی اس کو ساری عمر قدرت حاصل نہ ہوئی، ہم نے اُس کو زمانِ طالب علمی میں یا اُس کے بعد سبقاً سبقاً انگریزی پڑھتے تو نہیں دیکھا اور اُس کی خودداری مدرسے کے بعد اُس کو سینگ کٹوا کر بچھڑوں میں کیوں ملنے دینے لگتی تھی؟ مگر اتنا تحقیق سے معلوم ہے کہ وہ اپنی حالت کے مناسب انگریزی جاننے کے لیے بہتیری ہی کوشش کرتا تھا۔ سُنے سنائے سے جو اُس نے اِس قدر ترقی کی

سچ پوچھو تو یہ بھی اسی کا کام تھا، ورنہ اپنا تو یہ مقولہ ہے کہ آدمی مادری زبان کے علاوہ دوسری زبان کا زباں داں جیسا کہ زبان دانی کا حق ہے ہو ہی نہیں سکتا۔

کیا صاحب قاموس کی حکایت نہیں سُنی؟ بھلا خیر اتنا تو سنا ہوگا، کہ زبان عربی کی لغت کی بہت سی کتابیں ہیں۔ سب میں زیادہ مبسوط اور مستند قاموس ہے، صاحب قاموس ذات کا تھا عجمی، اُس کو بچپن سے زبان عربی کی تکمیل کا شوق ہوا، جہاں تک عجم میں ممکن تھا، سیکھ پڑھ لیا۔ نجد اور تہامہ اور یمن اور شام اور حضارۃ اور بداوہ میں برسوں زبان کے پیچھے خاک چھانتا پھرا آخر کار ساری عمر کی تفتیش اور تلاش کے بعد قاموس بنائی، تو پھر کیسی بنائی کہ ساری دنیا اُس کی سند پکڑتی ہے، زبان دانی کا پردہ خدا کو فاش کرنا تھا، عرب کی ایک بی بی سے نکاح کیا، رات کے وقت گھر کی لونڈی سے کہتے تھے کہ چراغ گل کر دے۔ طولنے کی ٹیں ٹیں کہاں جائے، اطفے السراج کی جگہ فارسی محاورے کے مطابق بے ساختہ اُقتلی السراج بول اٹھے، بی بی تاڑ گئی صبح اٹھ دار القضا میں جا نالش کی، خدا جانے بی بی رہی یا گئی مگر میاں کی عزیت کی تو خوب کرکری ہوئی، انگریزی اخباروں میں جن کے ایڈیٹر انگریز ہیں بابو انہ انگریزی کی ہمیشہ خاک اڑائی جاتی ہے، اگرچہ نام تو بنگالیوں کا ہوتا ہے، مگر حقیقت میں وہ ملاحی گالیاں سبھی انگریزی دانوں پر پڑتی ہیں، بلکہ دوسروں پر بدرجہ اولیٰ کیونکہ بنگالیوں نے تو یہاں تک انگریزی میں ترقی کی ہے کہ انگریزی گویا ان کی مادری زبان ہوتی جاتی ہے اور بعض بنگالی تو انگریزی میں اس درجے کے گویا اور فصیح اور بلیغ ہو گزرے ہیں اور ہیں کہ انگریز بھی اُن کا لوہا مانتے ہیں۔

مگر ایسی مثالیں شاذ ہیں۔

ایک دوست ناقل تھے کہ ایک بار اُن کو ایک انگریز سے ملنے کی ضرورت تھی، کوٹھی پر معلوم ہوا کہ یہ وقت اُن کے کلب میں رہنے کا ہے، ناچار اُن کو کلب جانا پڑا، چپراسی اطلاع کا موقع دیکھ رہا تھا، کہ انھوں نے اپنے کانوں سنا کہ اندر بہت سے انگریز جمع ہیں، اور ہندوستانیوں کی انگریزی کی نقلیں کر کر کے قہقہے لگا رہے ہیں، وہ دوست یہ بھی کہنے لگے کہ جس انگریزی کی ہنسی ہو رہی تھی بے شک وہ ہنسی کے قابل بھی تھی، اور اہل زبان کو ہمیشہ دوسرے ملک والوں پر ہنسنے کا حق ہے مگر ہندوستانیوں کی انگریزی اگر ہنسنے کے قابل ہے تو اس کے مقابل میں انگریزوں کی اُردو رونے کے لائق ہے، ہندوستانی صرف کتابوں کی مدد سے انگریزی سیکھتے ہیں، برخلاف انگریزوں کے کہ کتاب کے علاوہ ساری ساری عمر ہندوستانی سوسائٹی میں رہتے ہیں اور پھر وہی "ول تم کیا مانگٹا" یہ مصیبت کس کے آگے روئیں کہ انگریزی عملداری نے ہماری دولت، ثروت رسم ورواج، لباس، وضع، طور، طریقہ، تجارت، مذہب، علم، ہنر، عزت، شرافت سب چیزوں پر تو پانی پھرا ہی تھا ایک زبان تھی اب اُس کا بھی یہ حال ہے کہ اُدھر انگریزوں نے عجز واقفیت کی وجہ سے اکھڑی اکھڑی غلط نامربوط اُردو بولنی شروع کی اِدھر ہر عیب کہ سلطان بہ پسند د ہنر است، ہمارے ہی بھائی بند لگے اُس کی تقلید کرنے۔ ایک صاحب کا ذکر ہے کہ اچھی خاصی ریش و بروت آغاز جوانی میں ولایت گئے چار پانچ برس ولایت رہ کر آئے تو ایسی ستی بھولے کہ اُردو میں بہ ضرورت کبھی بات کرتے تو رک رک کر اور ٹھہر ٹھہر کر اور آنکھیں میچ میچ کر جیسے کوئی سوچ سوچ کر مغز سے بات اُتارتا ہے۔

شمس العلماء خواجہ الطاف حسین حالیؔ۔ پانی پتی

پیدائش ۱۸۳۷ء وفات ۱۹۱۴ء

الطاف حسین نام حالی تخلص۔ پانی پت میں پیدا ہوئے۔
تکمیل علم کے بعد نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے بچوں پر اتالیق ہو گئے اور
نواب صاحب سے پہلے اصلاح لیتے رہے وہیں غالب سے ملاقات ہو گئی
پھر ان کے شاگرد ہو گئے ۱۸۵۷ء میں پنجاب بک ڈپو لاہور میں اُردو
ترجمے جو مغربی ادب و علوم کی کتابوں کے ہوتے تھے ان کی زبان درست
کرنے پر مامور ہوئے۔ تو آپ کا رنگ شاعری بھی بدل گیا۔ کرنل ہال رائڈ
کی سرپرستی والے مشاعرے میں آپ بھی شریک ہوتے تھے۔ ۱۵ سال بعد
اینگلو عربک اسکول دہلی کے مدرس ہو گئے۔ حیدر آباد سے ان کا وظیفہ پہلے
۷۵ روپیہ ماہوار مقرر ہوا تھا پھر سو روپیہ ہو گیا۔

آپ نثر نہایت صاف اور سلجھی ہوئی لکھتے ہیں۔ کہیں پر مشکل عبارت
نہیں لکھتے فلسفیانہ اور ناقدانہ اور مورخانہ نقطہ نظر سے لکھتے ہیں۔
جملے بڑے بڑے ہوتے ہیں۔ عبارت غیر دلچسپ نہیں ہوتی۔ سنجیدہ اور
تلاش کیے ہوئے الفاظ سے مضمون کو سجاتے ہیں۔

حیات سعدی۔ یادگار غالب۔ حیات جاوید اور مقدمہ شعر و
شاعری آپ کی ممتاز کتابیں نثر میں ہیں۔ حیات جاوید میں سرسید کی

سوانح عمری ہے۔

آپ ایک کامیاب شاعر بھی تھے مسدس حالی۔ اور مدوجزر اسلام آپ کی معرکۃ الآرا نظمیں ہیں۔

مرزا غالب کی مشکل پسندی

مرزا نے گل رعنا کے دیباچے میں لکھا ہے کہ میں نے اول اردو زبان میں شعر کہنا شروع کیا تھا۔ اس لیے ہم بھی پہلے اردو دیوان کا ذکر کرتے ہیں۔ جس روش پر مرزا نے ابتدا میں اردو شعر کہنا شروع کیا تھا قطع نظر اس سے کہ اُس زمانے کا کلام خود ہمارے پاس موجود ہے۔ اس روش کا اندازہ اس حکایت سے بخوبی ہوتا ہے۔ خود مرزا کی زبانی سُنا گیا ہے کہ میر تقی نے جو مرزا کے ہم وطن تھے اُن کے لڑکپن کے اشعار سُن کر کہا تھا کہ "اگر اس لڑکے کو کوئی کامل استاد مل گیا اور اُس نے سیدھے راستہ پر ڈال دیا تو لاجواب شاعر بن جائے گا ورنہ مہمل بکنے لگے گا۔

مرزا کے ابتدائی اشعار دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ تو طبیعت کی مناسبت سے اور زیادہ تر ملّا عبدالصمد کی تعلیم کے

سبب فارسیت کا رنگ ابتدا ہی میں مرزا کے بول چال اور اُن کی قوت متخیلہ پر چڑھ گیا تھا۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح اکثر ذکی الطبع لڑکے ابتدا میں سیدھے سادے اشعار کی نسبت مشکل اور پیچیدہ اشعار کو جو بغیر غور و فکر کے آسانی سے سمجھ میں نہیں آتے زیادہ شوق سے دیکھتے اور پڑھتے ہیں۔
مرزا نے لڑکپن میں بیدل کا کلام زیادہ دیکھا تھا چنانچہ جو روش مرزا بیدل نے فارسی زبان میں اختراع کی تھی۔ اُسی روش پر مرزا نے اردو میں چلنا اختیار کیا تھا جیسا کہ وہ خود فرماتے ہیں۔

"طرز بیدل میں ریختہ لکھنا :۔
اسداللہ خاں قیامت ہے۔

یہاں بطور نمونے مرزا کے ابتدائے کلام میں سے چند اشعار لکھے جاتے ہیں :۔

کرے گر فکر خرابیائے دل گردوں ۔۔ نہ نکلے خشت مثل استخواں بیرون قالبہا
اسد ہر اشک ہے یک حلقہ بر زنجیر افزودن ۔۔ بہ بند گریہ ہے نقش بر آب امید رستن ہا
بحر نگاہ تازکشتہ جان بخشی خوباں ۔۔ خضر کو چشمۂ آب بقا سے تر جبیں پایا
رکھا غفلت نے دور افتادہ ذوق فنا ورنہ ۔۔ اشارت فہم کو ہر ناخن بریدہ ابرو تھا
پریشانی سے مغز سر ہوا ہے پنبۂ بالش ۔۔ خیال شوخی خوباں کو راحت آفریں پایا
موسم گل میں مے گلگوں حلال میکشاں ۔۔ عقد وصل دخت رز انگور کا ہر دانہ تھا

ساتھ جنبش کے یک بہ خاستن بطے ہو گیا گویا صحرا غبار دامن دیوانہ تھا

چونکہ مذکورہ بالا شعروں میں قطع نظر اس کے کہ طرز بیان اردو بول چال کے خلاف ہے خیالات میں بھی کوئی لطافت نہیں معلوم ہوتی۔ اس لیے ان کے معنی بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ صرف چوتھے شعر کی جو کسی قدر آسان ہے یہاں بطور نمونے کے شرح کی جاتی ہے تاکہ معلوم ہو کہ مرزا نے مشق سخن کس قسم کے خیالات سے شروع کی تھی اور کس قدر کاوش سے وہ یہ نئی قسم کے مضمون پیدا کرتے تھے۔

کہتا ہے کہ فنا میں جو لذّت اور ذوق تھا ہماری غفلت نے اس سے ہمیشہ دور دور رکھا۔ اگر یہ غفلت نہ ہوتی تو اشارت فہم کے لیے ہر ایک ناخن جو کاٹ کر پھینک دیا جاتا ہے۔ ابرو کا کام دیتا تھا ابرو کا کام ہے۔ اشارہ وایما کرنا اور ناخن بریدہ جو ابرو کی شکل ہوتا ہے وہ بھی فنا کی لذّت کی طرف اشارہ کرتا تھا کیونکہ ناخن کے کٹنے سے جو ایک قسم کی فنا ہے لذّت اور راحت حاصل ہوتی ہے۔

یہ اوپر کی سات بیتیں ہم نے مرزا کے ان نظری اشعار اور نظری غزلوں میں سے نقل کی ہیں جو انھوں نے اپنے دیوان ریختہ کو انتخاب کرتے وقت اس میں سے نکال ڈالی تھیں۔ مگر اب بھی ان کے دیوان میں ایک ثلث کے قریب بہت سے اشعار ایسے پائے جاتے ہیں جن

پر اُردو زبان کا اطلاق مشکل سے ہو سکتا ہے۔ جیسے ذیل کے اشعار جواب دیوان میں موجود ہیں۔

تماشائے بیک کف بردنِ صد دل پسند آیا
تمارسجہ مرغوبِ بُتِ مشکل پسند آیا

کہ انداز بخون غلطیدن بسمل پسند آیا
ہوائے سیرِ گل آئینہ بے مہری قاتل

تو ہو اور آپ بصد رنگ گلستاں ہونا
لے گئے خاک میں ہم داغ تمنائے نشاط

تا محیطِ بادہ صورت خانۂ خمیازہ تھا
شب خمارِ چشمِ ساقی رستخیز اندازہ تھا

جادہ اجزائے دو عالم دشت کا شیرازہ تھا
یک قدم وحشت سے درس دفترِ امکاں کھلا

ان اشعار کو مہمل کہو یا بے معنی مگر اس میں شک نہیں کہ مرزا نے وہ نہایت جانکاہی اور جگر کاوی سے سرانجام کیے ہوں گے جب کہ اپنے معمولی اشعار کاٹتے ہوئے لوگوں کا دل دکھتا ہے تو مرزا کا دل اپنے اشعار نظری کرتے ہوئے کیوں نہ دکھا ہوگا۔ ظاہرا یہی سبب تھا کہ انتخاب کے وقت بہت سے اشعار جو فی الواقع نظری کرنے کے قابل تھے اُن کے کاٹنے پر مرزا کا قلم نہ اٹھ سکا ممکن ہے کہ ایک مدت کے بعد یہ اشعار ان کی نظر میں کھٹکے ہوں۔ مگر چونکہ دیوان چھپ کر شائع ہو چکا تھا۔ اس لیے انھوں نے ان اشعار کا نکالنا فضول سمجھا۔

مرزا کے حق میں جو پیشین گوئی میر تقی نے کی تھی اس کی دونوں شقیں اُن کے حق میں پوری ہوئیں۔ ظاہر ہے کہ مرزا اوّل اوّل ایسے رستے پر پڑے تھے کہ اگر استقامت طبع اور

سلامت ذہن اور بعض صحیح المذاق دوستوں کی روک ٹوک
اور نکتہ چین ہمعصروں کی خردہ گیری اور طعن وتعریض سدراہ
نہ ہوتی تو وہ شدہ شدہ منزل مقصود سے بہت دُور جا پڑتے
گیا ہے کہ اہل دہلی مشاعروں میں جہاں مرزا بھی ہوتے تھے
تعریضاً ایسی غزلیں لکھ کر لاتے تھے جو الفاظ وترکیبوں کے
لحاظ سے بہت پر شوکت وشاندار معلوم ہوتی تھیں
مگر معنی ندارد گویا مرزا پر یہ ظاہر کرتے تھے کہ آپ کا
کلام ایسا ہوتا ہے۔

ایک دفعہ مولوی عبدالقادر رام پوری نے جو نہایت
ظریف الطبع تھے اور جن کو چند روز قلعہ دہلی سے تعلق رہا
تھا۔ مرزا سے کسی موقع پر یہ کہا کہ آپ کا ایک اُردو شعر
سمجھ میں نہیں آتا اور اُسی وقت دو مصرعے خود موزوں کرکے
مرزا کے سامنے پڑھے ؎

پہلے تو روغن گل بھینس کے انڈے سے نکال
پھر دوا جتنی ہے کل بھینس کے انڈے سے نکال

مرزا سُن کر سخت حیران ہوئے اور کہا حاشا یہ میرا شعر نہیں۔
مولوی عبدالقادر نے ازراہ مزاح کے کہا۔ میں نے خود آپ کے
دیوان میں دیکھا ہے، اور دیوان ہو تو میں اب دکھا سکتا ہوں۔
آخر مرزا کو معلوم ہوا کہ مجھ پر اس پیرایے میں اعتراض کرتے

ہیں، اور گویا یہ جتاتے ہیں کہ تمھارے دیوان میں اس قسم کے اشعار ہوتے ہیں۔

مرزا نے اس قسم کی نکتہ چینیوں پر اُردو فارسی دیوان میں جا بجا اشارہ کیا ہے اُردو میں ایک جگہ کہتے ہیں ؎

نہ ستایش کی تمنا نہ صلے کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

ایک اور اُردو غزل کا مطلع ہے ؎

گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے
خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے

یعنی اگر خاموشی سے یہ فائدہ ہے کہ حال دل ظاہر نہیں ہوتا تو میں خوش ہوں کہ میرا بولنا بھی خاموشی ہی کا فائدہ دیتا ہے۔ کیونکہ کلام کسی کی سمجھ ہی میں نہیں آتا۔

چونکہ مرزا کی طبیعت فطرتاً نہایت سلیم واقع ہوئی تھی اس لیے نکتہ چینیوں کی تعریفوں سے ان کو بہت تنبہ ہوتا تھا۔ اور آہستہ آہستہ اُن کی طبیعت راہ پر آتی جاتی تھی۔ اس کے سوا جب مولوی فضل حق سے مرزا کی راہ و رسم بہت بڑھ گئی اور مرزا اُن کو اپنا خالص مخلص دوست اور خیر خواہ سمجھنے لگے تو انھوں نے اس قسم کے اشعار پر بہت روک ٹوک کرنی شروع کی، یہاں تک کہ انھیں کی تحریک سے انھوں نے اپنے اُردو کلام میں

سے جو اس وقت موجود تھا دو ثلث کے قریب نکال ڈالا۔ اور اس کے بعد اُس روش پر چلنا بالکل چھوڑ دیا۔

مرزا نے ریختہ میں جو روش ابتدا میں اختیار کی تھی ظاہر ہے کہ وہ کسی طرح مقبول خاص و عام نہیں ہو سکتی تھی۔ لوگ عموماً میرؔ، سوداؔ۔ میر حسنؔ۔ جراتؔ اور انشاؔ وغیرہ کا سیدھا سادا۔ اور صاف کلام سننے کے عادی تھے۔ جو محاورے روزمرہ کی بول چال اور بات چیت میں برتے جاتے تھے انھیں کو جب اہل زبان وزن کے سانچے میں ڈھلا ہوا دیکھتے تھے تو اُن کو زیادہ لذت آتی تھی اور زیادہ لطف حاصل ہوتا تھا۔ شعر کی بڑی خوبی یہی سمجھی جاتی تھی کہ اِدھر قائل کے منہ سے نکلا اور اُدھر سامع کے دل میں اُتر گیا۔ مگر مرزا کے ابتدائی ریختے میں یہ بات بالکل نہ تھی جیسے خیالات اجنبی تھی ویسی ہی زبان غیر مانوس تھی۔ فارسی زبان کے مصادر، فارسی کے حروف ربط اور توابع فعل جو کہ فارسی کی خصوصیات میں سے ہیں۔ اُن کو مرزا اُردو میں عموماً استعمال کرتے تھے۔ اکثر اشعار ایسے ہوتے تھے کہ اگر اُن میں ایک لفظ بدل دیا جائے تو سارا شعر فارسی زبان کا ہو جائے۔ بعض اسلوب بیان خاص مرزا کے مخترعات میں سے تھے جو نہ اُن سے پہلے اُردو میں

دیکھے گئے نہ فارسی میں۔ مثلاً اُن کے موجودہ اُردو دیوان میں ایک شعر ہے ؎

قمری کفِ خاکستر و بلبل قفس رنگ
اے نالہ نشانِ جگرِ سوختہ کیا ہے

میں نے خود اس کے معنی مرزا سے پوچھے تھے، فرمایا کہ اے کی جگہ جُز پڑھو، معنی خود سمجھ میں آجائیں گے۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ قمری۔ جو ایک کفِ خاکستر سے زیادہ۔ اور بلبل قفسِ عنصری سے زیادہ نہیں۔ اُن کے جگر سوختہ یعنی عاشق ہونے کا ثبوت صرف اُن کے چہکنے اور بولنے سے ہوتا ہے۔ یہاں جس معنی میں مرزا نے اے کا لفظ استعمال کیا ہے۔ ظاہرا یہ اُنھیں کا اختراع ہے۔ ایک شخص نے یہ معنی سُن کر کہا کہ " اگر وہ اے کی جگہ جُز کا لفظ رکھ دیتے یا دوسرا مصرع اس طرح کہتے " اے نالہ نشاں میرے سوا عشق کا کیا ہے" تو مطلب صاف ہوجاتا " اُس شخص کا یہ کہنا بالکل صحیح ہے، مگر چونکہ مرزا معمولی اسلوبوں سے تابمقدور بچتے تھے اور شارعِ عام پر چلنا نہیں چاہتے تھے اس لیے وہ بہ نسبت اس کے کہ شعر عام فہم ہوجائے اس بات کو زیادہ پسند کرتے تھے کہ طرزِ خیال اور طرزِ بیان میں جدّت اور نرالا پن پایا جائے۔

مرزا کے ابتدائی کلام کو مہمل و بے معنی کہو یا اُس کو اُردو زبان کے دائرے سے خارج سمجھو مگر اس میں شک نہیں کہ اس سے اُن کی اُرجینلٹی اور غیر معمولی اُپج کا خاطر خواہ سراغ ملتا ہے اور یہی اُن کی ٹیڑھی ترچھی چالیں اُن کی بلند فطری اور غیر معمولی قابلیت و استعداد پر شہادت دیتی ہیں معمولی قابلیت و استعداد کے لوگوں کی معراج یہ ہے کہ جس پگ ڈنڈی پر اگلی بھیڑوں کا گلہ چلا جاتا ہے اُسی پر آنکھیں بند کرکے گلے کے پیچھے پیچھے ہو لیں، اور پگ سے اِدھر اُدھر آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھیں۔ جو ہُنر یا پیشہ اختیار کریں اُس میں اگلوں کی چال ڈھال سے سرمو تجاوز نہ کریں۔ اور اُن کے نقش قدم پر قدم رکھتے چلے جائیں وہ اپنے ارادے اور اختیار سے ایسا نہیں کرتے بلکہ دوسرے رستے پر چلنا اُن کی قدرت سے باہر ہوتا ہے۔

برخلاف اس کے جن کی طبیعت میں اُرجینلٹی اور غیر معمولی اُپج کا مادہ ہوتا ہے۔ وہ اپنے میں ایک ایسی چیز پاتے ہیں جو اگلوں کی پیروی پر اُن کو مجبور نہیں ہونے دیتی۔ ان کو قوم کی شاہ راہ کے سوا بہت سی راہیں ہر طرف کھلی نظر آتی ہیں۔ وہ جس عام روش پر اپنے ہم فنوں کو چلتا دیکھتے ہیں اُس پر چلنے سے ان کی طبیعت اُبا کرتی ہے یہ ممکن ہے کہ جو طریق غیر مسلوک وہ اختیار کریں وہ منزل مقصود تک

پہونچانے والا نہ ہو۔ مگر یہ ممکن نہیں کہ جب تک وہ دائیں بائیں چل پھر کر طبیعت کی جولانیاں نہ دیکھ لیں اور تھک کر چور نہ ہو جائیں، عام راہ گیروں کی طرح آنکھیں بند کر کے شارع عام پر پڑ جائیں۔

مرزا کی طبیعت اسی قسم کی واقع ہوئی تھی، وہ عام روش پر چلنے سے ناک چڑھاتے تھے وہ خست شرکا کے سبب خود شاعری سے نفرت ظاہر کرتے تھے۔ عامیانہ خیالات اور محاورات سے جہاں تک ہو سکتا تھا اجتناب کرتے تھے۔

ایک صاحب جو غالباً بنارس یا لکھنؤ سے دلّی میں آئے تھے، مرزا کے ایک شعر کی ان کے سامنے نہایت تعریف کی۔ مرزا نے کہا ارشاد تو ہو کونسا شعر ہے۔ انھوں نے میر امانی متخلص بہ اسد شاگرد مرزا رفیع کا یہ شعر پڑھا ؎

اسد اس جفا پر بتوں سے وفا کی
میرے شیر شاباش رحمت خدا کی

چونکہ شعر میں اسد تخلص واقع ہوا تھا انھوں نے یہ سمجھا کہ مرزا غالب کا شعر ہے مرزا یہ سن کر بہت جز بز ہوے اور فرمایا اگر یہ کسی اور اسد کا شعر ہے تو اس کو رحمت خدا کی اور اگر مجھ اسد کا شعر ہے تو مجھے لعنت خدا کی۔

مرزا کو اس شعر کا اپنی طرف منسوب ہونا غالباً اس لیے ناگوار گزرا ہوگا کہ میرے شیر رحمت خدا کی یہ دونوں محاورے زیادہ تر عامیوں اور سوقیوں کی زبان پر جاری ہیں اور اسد کی رعایت سے "میرے شعر" کہنا یہ بھی ان کی طبیعت کے خلاف تھا، کیونکہ ایسی متبذل رعایتوں کو جو ہر شخص کو بآسانی سوجھ جائیں متبذل جانتے تھے۔

اس قسم کی اور بہت سی حکایتیں ہیں جن سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف شاعری میں بلکہ وضع میں، لباس میں، طعام میں، طریق ماندو بود میں، یہاں تک کہ مرنے اور جینے میں بھی عام طریقے پر چلنا پسند نہ کرتے تھے۔ یہاں ایک لطیفہ قابل لکھنے کے ہے۔

مرنے کے آٹھ سات برس پہلے انھوں نے ایک مادہ تاریخ اپنی وفات کا نکالا تھا جس میں سنہ ۱۲۷۷ھ نکلتے تھے۔ اتفاق سے اسی سال شہر میں وبا آئی، مگر مرزا بچ گئے۔ اس امر کی نسبت ایک خط میں لکھتے ہیں "میاں سنہ ۱۲۷۷ھ کی بات غلط نہ تھی (یعنی اس سنہ میں مجھے مرنا چاہیے تھا) مگر میں نے وبائے عام میں مرنا اپنے لائق نہ سمجھا۔ واقعی اس میں میری کسرشان تھی۔ بعد رفع فساد ہوا کے سمجھ لیا جائے گا"۔
اگرچہ یہ محض ایک ہنسی کی بات لکھی ہے مگر ان کی طبیعت کا اقتضا اس سے صاف جھلکتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ مخاطب جس کو یہ خط لکھا ہے

وہ ان کی اس خصلت سے خوب واقف ہے۔

بہرحال مرزا ایک مدت کے بعد اپنی بے راہ روی سے خبردار ہوے اور استقامت طبع اور سلامتی ذہن نے اُن کو راہ راست پر ڈالے بغیر نہ چھوڑا۔ گو ان کا ابتدائی کلام جس کو وہ حد سے زیادہ جگر کاوی اور دماغ سوزی سے سرانجام کرتے تھے مقبول نہ ہوا، مگر چونکہ قوت متخیلہ سے بہت زیادہ کام کیا گیا تھا اور اس لیے اس میں غیر معمولی بلند پروازی پیدا ہو گئی تھی جب قوت ممیزہ نے اُس کی باگ اپنے قبضے میں لی تو اُس نے وہ جوہر نکالے جو کسی کے وہم و گمان میں نہ تھے۔

شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی

۱۸۵۷ء میں ضلع اعظم گڈھ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اعظم گڈھ میں حاصل کی۔ اس کے بعد غازی پور۔ رام پور۔ لاہور رہ کر مکمل کی۔ اپنے والد کے اصرار سے وکالت کا امتحان پاس کیا مگر بطور پیشہ ناپسند تھا ۱۸۸۲ء میں سرسید نے علی گڈھ میں ملازم رکھ لیا پھر سید علی بلگرامی کے وساطت سے حیدرآباد پہونچے۔ وہاں سے آکر لکھنؤ میں ندوۃ العلمار کے ناظم ہوگئے۔ ۱۹۱۴ء میں انتقال کیا۔

یہ ایک بلند پایہ ادیب سلیم المذاق نقاد۔ وسیع النظر مورخ حکیم الطبع فلسفی۔ شیریں بیان شاعر تھے۔ سرسید نے جس اردو انشا کی بنیاد ڈالی شبلی اس کے خاتم ہوئے۔ ان کی عبارت صاف سلیس اور دلنشیں ہوتی ہے ان میں ہر قسم کے مضامین کے ادا کرنے کی صلاحیت فطرتاً موجود تھی۔

شبلی کی نثر میں یہ سب کچھ ہے۔ سلاست۔ روانی۔ لطیف و نازک تشبیہیں۔ نادر استعارے۔ اور پھر ہر چیز برمحل۔ خوبصورت مناسب۔ شبلی کے بعد کے نثار مغرب کی تقلید میں ایسا پڑے کہ ان کی طرز نگارش میں انگلینڈ اور پھر فرانس کی ادائیں جھلکنے لگیں۔ شبلی کا انتقال ۱۹۱۴ء میں ہوا۔

ترکوں کے اخلاق و عادات و طرزِ معاشرت

قسطنطنیہ میں میں اگرچہ مستقل تین مہینے تک رہا۔ لیکن زبان کی اجنبیت کی وجہ سے ترکوں سے میرا میل جول بہت کم تھا۔ میرے ہم صحبت اور میرے احباب جس قدر تھے، شام کے عرب تھے اس لیے ترکوں کے اخلاق اور عادات کے متعلق میری واقفیت سرسری اور اجمالی ہے میں نے اکثر کالج اور اسکول اور صنعت وغیرہ کے کارخانے دیکھے۔ چند معزز عہدہ داران ملکی سے ملا اور اُن کے یہاں دعوتیں کھائیں قہوہ خانوں میں کبھی کسی سے ملاقات ہو گئی۔ ٹرام وے اور ریل پر کسی سے تعارف ہو گیا۔ غرض اس قسم کے موقعے تھے، جن میں مجھ کو ترکوں کے اخلاق و عادات کا تجربہ ہوا۔ اور اس باب میں میں جو کچھ لکھوں گا انہی واقعات کی بنا پر ہو گا۔

ہر چند میری واقفیت کے ذریعے اس قدر محدود ہیں تاہم بعض امور کی نسبت مجھ کو بالکل یقین ہے کہ اُن کے متعلق میری جو رائے قایم ہوئی ہے وہ قطعاً صحیح ہے۔ اور اس میں ذرا بھی غلطی کا احتمال نہیں، ان میں سب سے مقدم ترکوں کی مہمان پرستی اور عام خوش اخلاقی ہے، کچھ شبہ نہیں کہ ترکوں کے اخلاق نہایت وسیع اور فیاضانہ ہیں غرور و نخوت، ترفع اور کم بینی ان میں نام کو نہیں، امیر و غریب، مزدور و عہدہ دار و شریف۔ جاہل و عالم ہر درجے کے لوگوں سے مجھ کو

سابقہ پڑا لیکن خوش اخلاقی اور فیاض طبعی میں گویا سب ایک ہی مکتب کے شاگرد اور ایک ہی سانچے کے ڈھلے تھے۔ غازی عثمان پاشا کو پلونا کے واقعے نے تمام دنیا میں روشناس کر دیا ہے اور درونیش پاشا جن کا پوتا سلطان کی دامادی کا شرف رکھتا ہے۔ اس مرتبے کے لوگ ہیں، جیسے ہندوستان میں گورنر جنرل یا کمانڈر انچیف۔ میں دونوں سے ملا ہوں۔ اور وہ جس تواضع اور خوش اخلاقی سے پیش آئے اس کا اثر اب تک میرے دل میں ہے۔

ایک عام بات یہ ہے کہ بازار میں چلتے چلتے تم جس شخص سے گو وہ کسی رتبہ کا آدمی ہو راستہ پوچھو وہ نہایت مہربانی سے تمھاری طرف متوجہ ہوگا اور تم کو راستہ بتائے گا۔ بعض موقعوں پر مجھ کو نہایت تنگ اور پیچدار گلیوں سے گذرنے کا اتفاق ہوا اور راستہ کے بھول جانے کی وجہ سے دیر تک حیران رہا۔ اتفاقاً کوئی ترک آ نکلا تو اُس نے راستہ بتانے پر اکتفا نہیں کی بلکہ ساتھ ہو لیا اور جہاں مجھ کو جانا تھا وہاں تک پہونچا کر واپس آیا۔

فیاضی اور مہمان نوازی ترکوں کی عام صفت ہے اور نہایت ادنےٰ درجے کے لوگ بھی نہایت سیر چشم اور فیاض ہیں۔ یہ عام طریقہ ہے کہ دو چار چشم آشنا کسی ہوٹل یا قہوہ خانے میں اتفاق سے مل گئے تو قہوہ وغیرہ میں جو کچھ خرچ ہوگا۔ ایک شخص سب کی طرف سے دیدے گا گویا تمام لوگ اس شخص کے مہمان ہوتے ہیں اور وہ میزبان ہوتا ہے

خونگرصوی جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے میں اس کی سیر کو گیا تو خوجے آفندی ساتھ تھے، چونکہ یہ مقام قسطنطنیہ سے بیس پچیس میل ہے اور میرے ساتھ اور بھی چند احباب تھے جہاز اور گاڑی کا کرایہ اور تفکہ وغیرہ میں سولہ روپیہ خرچ ہوئے یہ کل رقم خوجے آفندی نے ادا کی۔ میرے شامی احباب کو جو خود مقتدر اور فیاض طبع تھے۔ آفندی صاحب کا زیر بار احسان ہونا گوارا نہ تھا۔ لیکن ملک کے رواج کی وجہ سے زیادہ اصرار نہ کرسکے۔

ایک دفعہ میں درویش پاشا کے مکان پر گیا وہاں چند اور بزرگ تشریف رکھتے تھے۔ سب سے تعارف ہوا اور دیر تک صحبت رہی چونکہ اس وقت تک میں نے ترکی بوٹ کا استعمال نہیں شروع کیا تھا اور انگریزی بوٹ پہن کر مکان کے اندر جانا یہاں معیوب ہے میں نے دروازے ہی پر بوٹ اُتار دیا تھا ترکوں کے نزدیک بوٹ کا پاؤں میں نہ ہونا بدسلیقگی میں داخل ہے۔ اس لیے کسی کسی کو خیال ہوا حاضرین میں سے ایک بزرگ جو اسکول کے ماسٹر اور معزز آدمی تھے چپکے سے اُٹھے اور ایک سلیپر میرے سامنے رکھ دیا ان بزرگ کا نام کاظم آفندی تھا۔ نوجوان آدمی ہیں۔ ریاضی میں ان کی تصنیف حضور سلطانی میں پیش ہو چکی ہے۔ رخصت ہونے کے وقت مجھ سے فرمایا کہ ہندوستان پہونچ کر یاد رکھئے گا کہ قسطنطنیہ میں کاظم بھی آپ کا نیاز مند تھا۔

حسین حسیب آفندی جو پولیس کمشنر اور معزز رتبے کے آدمی ہیں ملاقات کے ساتھ اس لطف و مہربانی سے پیش آئے کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ اصرار کر کے کھانا کھلایا۔ کوٹھی اور پائیں باغ کی سیر کرائی۔ پردہ کرا کر زنانہ مکان کے تمام کمرے دکھائے۔ رخصت ہونے لگا تو فرمایا کہ مجھ کو بھی کچہری جانا ہے۔ ساتھ ہی چلیں گے۔ چنانچہ اپنی گاڑی پر بٹھا کر دُور تک ساتھ لائے۔ لطف یہ کہ اس وقت تک میرا ذریعہ تعارف بجز اس کے اور کچھ نہ تھا کہ میں ہندوستان کا رہنے والا ہوں۔ اور مسلمان اس قسم کے واقعات سے قطعاً ثابت ہوتا ہے کہ ترکوں کے اخلاق نہایت عام ہیں اور اس کے لیے وسیلہ و تعارف عزّت و جاہ کی سفارش کی کچھ ضرورت نہیں۔

ترکوں کی معاشرت کا طریقہ نہایت پسندیدہ اور قابل تقلید ہے۔ امرا اور معزز عہدہ دار ایک طرف معمولی حیثیت کا آدمی بھی جس صفائی اور خوش سلیقگی سے بسر کرتا ہے۔ ہمارے ملک میں بڑے بڑے امیروں کو وہ بات نصیب نہیں میں نے دس ہزار کے تنخواہ دار سے لے کر بیس روپیہ کی آمدنی والوں تک کے مکانات دیکھے ہیں۔ اگرچہ دونوں حالتوں میں نہایت تفاوت تھا۔ اور ہونا چاہیے تھا۔ تاہم خوش سلیقگی اور ترتیب و صفائی میں برابر برابر تھے۔

ڈرائنگ روم کا قدیم طریقہ یہ تھا اور متوسط حیثیت والوں میں اب بھی جاری ہے کہ دیوار سے متصل قریبًا دو ہاتھ چوڑے اور دیوار کے طول کی برابر لمبے چبوترے بنے ہوتے ہیں۔ اور ان پر گدا بچھا ہوتا ہے' اب اگرچہ میز و کرسی کا زیادہ رواج ہے۔ تاہم چونکہ معزز ترکوں کے یہاں علماء اور درویشوں کی اکثر آمد و رفت رہتی ہے۔ ایک آدھ کمرہ اس طریقہ پر بھی ضرور مرتب رہتا ہے۔ میں نے عثمان پاشا اور درویش پاشا کے عالی شان مکانوں میں بھی اس وضع کے متعدد کمرے دیکھے زمانہ حال میں یوروبین طریقہ زیادہ مروّج ہے۔ ترکوں نے اس میں اپنی طرف سے کچھ اصلاحیں کی ہیں اور وہ درحقیقت قابل تعریف اصلاحیں ہیں۔ ڈرائنگ روم میں (جو اکثر عمدہ ٹرکش قالین سے آراستہ ہوتا ہے) اس سرے سے اُس سرے تک سڑک کے طور پر کارپٹ وغیرہ کی ہاتھ ہاتھ بھر چوڑی پٹیاں بچھی ہوتی ہیں۔ کمرے میں جو لوگ آتے جاتے ہیں اسی پر سے گذرتے ہیں۔ اِدھر اُدھر پاؤں نہیں رکھ سکتے۔ ترکوں کا بوٹ اگرچہ خاک آلودہ نہیں ہوتا۔ لیکن اس طریقے سے فرش اور بھی صاف و پاک رہتا ہے۔

کھانا یوربین طریقہ پر یعنی میز کرسی پر کھاتے ہیں۔ البتہ بعض باتوں میں فرق ہے۔ اور میری دانست میں وہ اصلاح طلب ہیں عام دستور یہ ہے کہ جب تمام لوگ میز کے گرد کرسیوں پر بیٹھ جاتے

ہیں تو نوکر آکر ہر شخص کے آگے سادہ رکابیاں چن دیتا ہے۔ اس کے بعد باری باری مختلف کھانوں کی رکابیاں آتی ہیں اور میز کے بیچ میں رکھی جاتی ہیں تمام لوگ ایک ہی رکابی میں کھاتے ہیں۔ چھری کانٹا بھی ہوتا ہے۔ لیکن اکثر کھاتے ہاتھ سے ہیں میں نے حسیب آفندی پولیس کمشنر اور درویش پاشا کے یہاں کھانا کھایا۔ درویش پاشا کے بیٹے احمد پاشا جو سلطان المعظم کے سمدھی ہیں۔ میز پر ہمارے ساتھ تھے، اور اسی طریقہ سے کھاتے تھے، لوگوں نے بیان کیا کہ اب یہ طریقہ متروک ہوتا جاتا ہے اور حال کے تعلیم یافتہ بالکل یورپین طریقہ پر کھاتے ہیں۔

ہندوستان کے برخلاف عام دستور ہے کہ مکانات کے دروازے ہمیشہ بند رہتے ہیں۔ اندر ایک کھٹکا ہوتا ہے جو دروازہ بند کرنے کے وقت خود بخود لگ جاتا ہے، باہر کی طرف ایک کڑا ہوتا ہے۔ کوئی شخص کسی سے ملنے کو جاتا ہے تو کڑے سے دروازہ کو کھٹکھٹاتا ہے آواز سن کر نوکر یا صاحب خانہ کواڑ کھول دیتا ہے امراء کے یہاں دروازہ کے بیرونی رُخ پر پیتل کا پھول لگا ہوتا ہے۔ اس کے دبانے سے اندر گھنٹی بجتی ہے اور نوکر کو خبر ہو جاتی ہے۔ یہ طریقہ نہایت عام ہے یہاں تک کہ غریب سے غریب آدمی کے دروازے بھی کھلے نہیں رہتے۔ اگرچہ دراصل سردی سے بچنے کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے، لیکن اس سے طرزِ معاشرت میں خود بخود نہایت تہذیب و

اصلاح پیدا ہو گئی۔

ترکوں کا لباس جیسا کہ میں اوپر لکھ آیا ہوں بالکل یورپین ہے، البتہ بوٹ میں ایک اختراع کی گئی ہے اور وہ واقع میں قابل تعریف ہے یہ بوٹ چرمی جراب اور سلیپر کا مجموعہ ہے۔ جراب بالکل بوٹ کی شکل کی ہوتی ہے لیکن ایڑی نہیں ہوتی۔ سلیپر میں اندر ایڑی کے پاس ایک کھٹکا لگا ہوتا ہے۔ جراب پہن کر جب اُس کو پہنتے ہیں تو جراب اس میں اٹک جاتی ہے، اور دونوں مل کر خاصہ بوٹ بن جاتا ہے بازار میں پہنے پھرتے ہیں۔ لیکن فرش پر سلیپر اتار دیتے ہیں۔ صرف جراب رہ جاتی ہے، اور چونکہ وہ گرد سے پاک ہوتی ہے فرش پر دھبہ نہیں پڑتا۔

ملاقات کا طریقہ نہایت مہذب اور پسندیدہ ہے تم کسی سے ملنے جاؤ اور دروازہ کھٹکھٹاؤ تو اسی وقت نوکر آ کر دروازہ کھولے گا۔ مکان میں اسی غرض سے ایک خاص کمرہ فرش فروش سے آراستہ رہتا ہے نوکر تم کو وہاں بٹھا دے گا اور قہوہ یا چائے پیش کرے گا اس کے بعد صاحب خانہ کو اطلاع ہوگی۔ وہ ملاقات کے کمرے میں بیٹھے گا اور تم کو وہیں بلائے گا۔ بڑے بڑے معزز افسروں کی ملاقات کا یہی طریقہ ہے انگریزوں کی طرح۔ حاطہ کے باہر برانڈے میں ٹہلنا اور دیر تک انتظار کرنا نہیں پڑتا۔

سلام کرنے کا عجیب طریقہ ہے پہلے سینہ پر ہونٹوں پر پھر پیشانی

پر ہاتھ رکھتے ہیں۔ ان اعضاء کا ہاتھ سے چھو لینا ضرور نہیں صرف محاذات کافی ہے۔ اگرچہ اس طریقہ پر سلام کرنے میں ہاتھ کو تین منزلیں طے کرنی پڑتی ہیں۔ لیکن مشاق کی وجہ سے تینوں مرحلے اس جلدی سے طے ہوتے ہیں کہ معمولی سلام سے زیادہ عرصہ نہیں لگتا۔ اس ایجاد میں یہ فائدہ ہے کہ قد کو جھکانا نہیں پڑتا۔ اور ایشیائی تعظیم وادب بھی ہاتھ سے نہیں جاتا۔ مجلس میں سلام کرنے کا جو طریقہ ہے وہ زیادہ تکلف آمیز ہے، یعنی بیٹھ جانے کے بعد حاضرین میں سے ہر شخص کی طرف الگ الگ مخاطب ہو کر سلام کرنا پڑتا ہے بالکل اس طرح جیسا لکھنؤ میں دستور ہے۔ معلوم نہیں ترک جیسے سپاہیوں کو یہ لکھنؤانہ تکلف کس نے سکھایا۔

ترکوں کی معاشرت میں مجھ کو جو چیز سب سے زیادہ پسند ہے وہ یہ ہے کہ باوجود نفاست پسندی اور عالی دماغی کے فضول شان وشوکت کا نام نہیں۔ بڑے بڑے وزراء امراء بازار میں نکلتے ہیں تو معمولی حیثیت سے نکلتے ہیں۔ میں نے بارہا وزیر اعظم کی سواری دیکھی ہے۔ صرف دو تین سوار ساتھ ہوتے ہیں۔

(از سفرنامہ)

پنڈت رتن ناتھ سرشار

پنڈت رتن ناتھ سرشار ۱۸۴۶ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ اس زمانہ کی طرز زندگی کے بموجب عربی و فارسی کی تعلیم گھر میں رہ کر حاصل کی۔ دونوں زبانوں میں مہارت حاصل کر کے سرشار کیننگ کالج میں انٹرنس کلاس میں داخل ہوئے لیکن انگریزی کی تکمیل کیے بغیر کالج ترک کر دیا۔ مراسلۂ کشمیر لکھنؤ کے کشمیری پنڈتوں نے ایک رسالہ نکالا تھا سرشار اس میں مضمون لکھنے لگے۔ پھر اودھ پنچ میں مضمون دینے لگے۔ حقیقتاً سرشار کی ادبی زندگی کی ابتدا اودھ پنچ ہی سے شروع ہوئی۔ پھر اودھ اخبار کے ایڈیٹر ہو گئے اسی اخبار میں ان کا ناول "فسانۂ آزاد" قسط وار نکلنے لگا۔ ناول کی دلچسپی نے اخبار کی اشاعت میں اضافہ کیا۔ اردو میں یہ پہلا ناول ہے جو فنی اعتبار سے بڑے پایہ کا ہے اگرچہ اس میں ظرافت کا پہلو زیادہ نمایاں ہے مگر زندگی کی صحیح اور سچی تصویریں یہاں ملتی ہیں۔

اس کی زبان نہایت اعلیٰ درجے کی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ سرشار کے پاس ہر طرح کے الفاظ کا خزانہ حاضر ہے کہ وہ طرح طرح کے واقعات و سانحات کو حالات و کیفیات کو صحت و تشریح کے ساتھ ادا کرنے پر قادر تھے۔ مکالمے جیسے ان کے ناول میں ہیں کہیں اور نظر نہیں آتے

ان کی عبارت میں غضب کا جوش پایا جاتا ہے۔ لکھنؤ کے محاورات بالخصوص بیگمات کی زبان پر آپ کو پوری پوری قدرت حاصل ہے۔ سرشار ۱۸۹۵ء میں حیدرآباد چلے گئے۔ اور ۱۹۰۲ء میں وہیں انتقال کیا۔

آٹھوں کا میلہ

وہاں سے جو میاں آزاد تیر کی طرح رواں ہوئے تو راہ میں دیکھا کہ کئی مسافر لدے پھندے جا رہے ہیں۔ کیوں بھئی اس وقت کہاں؟ لکھنؤ! لکھنؤ؟ یہ کیوں؟ کیوں کیا۔ آٹھوں کا میلہ ہے یا نہیں۔ اس دھوم دھڑکے کا میلہ دیکھا نہ سنا۔ ہاں تو اب ہم بھی چلتے ہیں۔ محرم الحرام اور بہار بسنت کے تو خوب مزے اڑائے، اب چلئے یہ میلہ بھی دیکھ لیں کیا جانیں پھر باقی چھوٹے گھوڑا اچھوٹے۔ یہ کہہ کر میاں آزاد بھی لکھنؤ چلے۔ نور کے تڑکے داخل۔ سبحان اللہ کیا صبح ہے! عارفان حق پرست کے دل کی طرح نورانی اور باطن میں اہل تصوف کے مثل مہبط فیض ربانی جدھر دیکھو تجلی، اور نور۔ جدھر جاؤ لطف اور سرور۔ سلطان خاوری کے تاج زریں کی چمک اشعۂ زرنگار سے ذروں کی جھلک نمودار درودیوار سے آیہ وجعلنا الشمس ضیاءً آشکار۔ شنبہ کا دن جس کی شان میں فصحا نے کہا ہے (کہ مکتب خانہ ہا را روز بازار از دست واطفال دبستان سبق آموزاد الف ابجد زبانان است

و نقطۂ ادلیس پرکار دوراں) دیکھتے کیا ہیں کہ صبح ہی سے میلے کا رنگ جما ہے۔ نخل بہار کی نشو و نما ہے۔ غٹ کے غٹ۔ ٹھٹ کے ٹھٹ۔ شہدے لچے۔ لونڈے بچے۔ گرہ کٹ۔ جیب کترے۔ چرسے۔ مدکیے۔ گنجرے بھنگیرے۔ شریف و نجیب۔ زیرک و لبیب، سب جوق جوق اُمنڈے آتے ہیں۔ نامردان ہوادار۔ رہوار باد رفتار۔ فینس زرنگار۔ ٹٹو گھوڑا سب خراماں خراماں پو قدمے آتے ہیں۔ کبھی یہ کبھی ٹولی پڑتی ہے۔ رنگیلوں چھیل چھبیلوں کی بن آئی۔ گاڑی بوٹ چڑھائی بن ٹھن کے چھیلا بن کے میلہ دیکھنے چلے۔ بالوں میں حنا کا تیل چھوڑے، کیچل لبسٹ کا دھانی رومال اُوڑھے، دو انگل مانگ کھولے۔ بانڈی سے پٹی جمائے گھڑی لگائے۔ ڈاڑھی چڑھائے گلے میں گلو بند دلفریب شربتی کا انگرکھا تن کا زیب۔ پاؤں میں مخملی جوتی، کاشانی یا سوتی قہقہے اڑاتے آنکھیں لڑاتے جا رہے ہیں۔ اِدھر اُدھر نظارہ بازی کر کے مسکرا رہے ہیں۔ فینس پر ماہ رو گھٹتے سے بیٹھی ہیں مگر بند۔ ہٹو بچو کا شور بلند۔ ساقیوں کا بازار گرم۔ کسی نے دو کش پیٔے ٹکا ہتھیایا۔ ساقیوں کی دکانیں دھواں دھار۔ تنبولیوں کے بیڑے مزے دار۔ کان میلے کی سرگوشی۔ حجام کی رونمائی۔ برف والے کی سردمہری۔ سنگرنوں کی ہانک آنب کے مجے کی کمر کہ ہیں۔ کابل کا میوہ رس بھری۔ تاج گلابیاں شہتوت بوٹ لوہرے بھبوے بوٹ۔ کسی طرف سرمہ، مسی، شیشہ، کنگھی، دیا سلائی کی ڈبیا ہے۔ بختی بھولا ناتھ کا باغ میلے کا چشم و چراغ ہے۔ ٹکیٹ ملے

کا تالاب ہزاروں میں انتخاب لاکھوں میں لاجواب ہے جو سلسبیل کوثر کو شرمائے، شبنم دیکھے تو پانی پانی ہو جائے۔ عجیب لطف دسماں ہے ہزارہا تماشائی تالاب کے اردگرد بستر جمائے۔ کوئی دری کوئی زین پوش بچھائے بیٹھا میلہ دیکھ رہا ہے۔ کوئی جانیان جہان گشت چکر لگا رہا ہے کوئی ہوا کھاتا ہے۔ کوئی فینس پر ایک جوان رعنا دموہ کا ڈھوہ پچیس برس کا سن، چلنے پھرنے کے دن لدا ہوا جا رہا ہے۔ کوئی ٹٹو کو ٹخ ٹخ کرتا آ رہا ہے۔ امرا کے لڑکے زیور سے گوندنی کی طرح لدے مٹھائی خریدنے میں مصروف ہیں، مگر خدمت گار دیکھ بھال رہا ہے کہ کوئی دست چالاک ہاتھوں ہاتھ پاؤں کے گھونگھر و نہ اڑا لے۔ عورتیں الگ زیور سے منجلی گھونگھٹ کاڑھے دبکی چلی جاتی ہیں۔ کہ کوئی چوہے دنتیاں نہ موس لے جائے۔ تخت رواں آتے ہیں۔ شعبدہ باز سوانگ لاتے ہیں۔ کوئی دہکتا انگارا کھا گیا۔ کوئی لوہے کے چنے کرکرکے چبا گیا۔ برہمن ڈول لیے گشت لگاتے ہیں۔ سقے اور بہشتی کٹورے کھنکھناتے ہیں۔ سہ پہر تک خوب جمگھٹا رہا۔ چراغ روشن ہوئے اور یار لوگ کھسکے۔ کسی نے مٹی کا ہوا لیا۔ کسی نے روئی کا لنگور اتنے میں ایک ریلا آیا تو کھلونے چکنا چور۔ ایک نے غل مچایا کہ وہ ہاتھی آیا۔ بھیڑ چھٹ گئی اور ڈرتے ہوئے چلے مگر بگڑے دل اپنی جگہ سے نہ ٹلے۔ شربتی کا انگرکھا چاہے ان کا دُزدیوں میں چرے نکل جائے مگر ممکن کیا کہ بل جائے۔ اس بھیڑ بھاڑ میں پولیس کا انتظام خوب رہا

جو ٹٹے اچکے جا کر بجھتائے بھلے مانس مزے سے گھر آئے۔

ہوٹل

میاں آزاد خانہ برباد یہاں بستر جمانے یا کسی مکان کا قبالہ لکھوانے تو آئے تھے نہیں۔ راہ راہ آئے۔ دو تین دن رہے چلے گئے لکھنؤ کے اسٹیشن پر پہونچے تو وہ چہل پہل وہ بھیڑ بھڑکا، وہ دھکم دھکا کہ شانہ سے شانہ چھلتا تھا برہمن دیوتا ڈول لیے کھٹ کھٹاتے چلے جاتے ہیں۔ جل ٹھنڈے۔ کٹورا الگ کھنک رہا ہے۔ میاں بھشتا مشک یا مشکیزہ لیے ہوئے چہل قدمی کر رہے ہیں ایک سمت ساقی دوسرا خیمہ بھر گڑگڑی لیے گڑگڑا رہا ہے وہ مشکبو کہ دماغ طبلۂ عطار ہو جائے۔ چبوترے کے سامنے کمہار برتن چن کر بیٹھا بیچ رہا ہے۔ مٹی کے کھلونوں پر وہ جوبن کہ باہر والے بصد شوق خرید لے جاتے ہیں۔ خریداروں پر خریدار ٹوٹے پڑتے ہیں پیسہ پھینکا اور حقہ لیا۔ اُدھر میاں بھشتانے تازہ کر دیا اور ساقی نے چلم تیار کی۔ دھواں دھار اڑانے لگے۔ کھٹک نے آواز لگائی۔ گلابی میوہ شہتوت، امرس ہے آم کے رسوں کا قلمی آم سے رسول کا فقیر محمد خاں کے باغ کا سفیدہ۔ بنارس کا لنگڑا چار باغ کا بمبئی رنگترے۔ سنگترے۔ کولے اناس، نارنگیاں، شریفہ، امرود، سیب جو چاہیے

خرید لیجئے۔ ایک طرف حلوائی کی دوکان، مٹھائی کے خوان، برنی کے تھال، ورق نقرہ لگے ہوئے پستے کی ہوائیاں، لوہے کے چراغ لٹکے ہوئے ہیں۔ دوکان جھک جھک کر رہی ہے۔ اتنے میں آواز آئی بسکٹ لو بسکٹ، کباب، کلیجے۔ اِدھر اُدھر گھومے تو سامنے ٹوپی والا آن موجود ہوا۔ دو پلی ٹوپیاں، شربتی جامدانی، چکن، مری کے کام کی کڑھی۔ منڈیل گول ٹوپی۔ نئے نئے فیشن۔ نرالی اور انوکھی وضع کی ٹوپیاں جھڑا جھڑ دکھا رہا ہے۔ اور گاہک پر گاہک بصد شوق دام چکا رہا ہے۔ دس پانچ ہاتھوں ہاتھ بک گئیں۔ دُور دُور تک مسافر بستر جمائے۔ کوئی زین پوش، کوئی دری بچھائے، ریل کی راہ تک رہا ہے کوئی گنوار اُکڑوں بیٹھا اناپ شناپ بک رہا ہے۔

میاں آزاد نے دل میں سوچے کہ اللہ اللہ ریل کا اسٹیشن کیا ہے خاصہ میلہ ہے۔ کچھ ٹھکانا ہے، یہ بھیڑ، یہ دھوم، یہ رونق، بھئی واہ رے لکھنؤ واللہ ایسا اسٹیشن بھی نہیں دیکھا۔ میاں آزاد ٹہلتے ہوئے اسٹیشن کے اندر گئے۔ ہوٹل دیکھا تو باچھیں کھل گئیں۔ اُہو ہو ہو کیا صاف و شفاف ہے ہر شے قرینے سے چنی ہوئی۔ در و دیوار سے صفائی برس رہی ہے۔ ہر سمت نور کا عالم ہے۔ اس سرے سے اس سرے تک میز اور اس کے گرداگرد کرسیاں گلاس چُنے ہوئے لمپ اور کنول ہر طرف روشن ہیں۔ میاں آزاد بھی کرسی پر جا کر ڈٹ گئے کھانا لاؤ۔ مگر شراب کا لگاؤ نہ ہوا اور لحم خوک قریب نہ آنے پائے۔ ایک چپراسی

صاف ستھرے کپڑے پہنے ہوئے چوبداروں کی سی پگڑی باندھے ہوئے سامنے آن کھڑا ہوا حضور شراب تو نہ ہو گی مگر اور کیا آپ نے حکم دیا میاں آزاد نے کہا لحم خوک (آہستہ سے) یعنی سُور کا گوشت نہ ہو (چپراسی) نا حضور کیا مجال۔ یہ کہہ کر چپراسی نہایت ہی قیمتی بیش بہا پلیٹوں میں طرح طرح کا انگریزی کھانا لایا۔ میاں آزاد نے چھری کانٹے سے خوب مزے سے چکھا اور سوڈا واٹر اور لیمونیڈ پیا اور باہر پہونچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ میاں خوجی بھی بستر جمائے ہوئے پڑا ٹھے اور کباب کلیجے چکھ رہے ہیں۔

آزاد۔ واہ استاد تم تو خوب مزے سے کباب اڑا رہے ہو۔

خوجی۔ پھر کوئی شراب اڑائے۔ کوئی کباب کھائے۔

آزاد۔ ایں! شراب! لاحول ولا قوۃ۔ اے میاں شراب کس نے مُنہ سے لگائی یہ کس کی شامت آئی۔ یہاں دخت رز سے واسطہ ہی نہیں رکھتے۔ بنت العنب کے عاشق دلدادہ کوئی اور ہی ہوں گے۔

ع کردم ز شراب ناب توبہ

خوجی۔ سادر آگے تو دیکھئے۔ ع کردم ز شراب ناب توبہ۔ اور آگے ع وز کردۂ ناصواب توبہ

آزاد۔ قسم قرآن کی کس مردک نے شراب کا ایک قطرہ بھی چھوا ہو شراب پی ہو تو سور کا گوشت کھایا ہو۔

خوجی۔ (مسکرا کر) تسلیم ایک نہ شد دو شد۔ آپ نے سور کا

گوشت بھلا کب چھوڑا ہوگا۔ واللہ مانتا ہوں۔ کہنے لگے شراب پی ہو تو سور کا گوشت کھایا ہو۔ معقول! یہ تو آپ تب کہیں جب اُس کو حرام ومکروہ بھی سمجھیں۔ آپ دونوں کو حلال اور اُن کے استعمال کو مستحسن سمجھتے ہیں۔ یار آج تو تم نے غضب ہی کر دیا۔

آزاد۔ ارے بھئی آخر کیا کیا، کچھ کہو گے بھی، یا ملّا ہی سنائے جاؤ گے۔ سبحان اللہ۔ قسم لو جو ہم نے شراب کو ہاتھ بھی لگایا ہو، یا سور کے گوشت کی صورت بھی دیکھی ہو۔

خوجی۔ ہاں یہ آپ نے خوب کہی کہ سور کے گوشت کی صورت نہیں دیکھی ہوگی۔ مگر یار مزا تو خوب چکھا ہوگا۔ اور شراب کو ہاتھ آپ کیوں لگاتے، گلے لگائی ہوگی، گلے!! اور آپ کی قسم کا کس مردود کو اعتبار ہے۔ قسم کو تو آپ مانتے ہی نہیں۔ مجھے آج تک یہی نہیں معلوم ہوا کہ آپ کا دین ایمان کیا ہے۔ تمھارا تو باوا آدم ہی نرالا ہے۔ خیر جی اپنی اپنی سب بھگت لیں گے ہم کو اس بکھیڑے سے کیا واسطہ۔

آزاد۔ نہ ہاری مانتے ہو نہ جیتی

خوجی۔ مانیں کیا خاک۔ مانیں کیا۔ ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ چھری کانٹا کھٹ کھٹ چل رہا ہے۔

آزاد۔ تو بھائی چھری کانٹے سے کوئی شراب پیتا ہے۔

خوجی۔ ہم کیا جانیں۔ ہماری جانے جوتی کہ شراب کیوں کر پیتے ہیں۔ یہ کسی اپنے ایسے میگسار بادہ خوار سے تحقیقات کیجئے۔ افسوس،

واللہ بس تم گئے گذرے۔ ہائے ستم۔ خیر مضیٰ ما مضیٰ۔

آزاد۔ آپ ایک کام کیجئے۔ ہوٹل میں جاکر۔

خوجی۔ لے لاحول! اے لال۔ خدا ایسی جگہ کسی سچے اور پکے مسلمان کو نہ لے جائے۔ توبہ توبہ (اپنے کان پکڑ کر) خداوندا بچا یئو۔ گنہگار بندہ ہوں۔ ارے توبہ۔ ہوٹل میں اور ہم جائیں۔ لاحول ولاقوۃ۔ بس آپ ہی کو مبارک رہے۔ قبلہ بندہ در گذرا۔

میاں آزاد ٹہلنے لگے اور خوجی نے کباب اور کلیچوں پر خوب ہتھے لگائے جب صفاچٹ کر چکے تو حلوائی کی دوکان سے برفی لائے اور افیون کے نشے میں ڈنگارنے لگے، تو اتنے میں ایک صاحب ریش دراز یکمشت و پنجاہ انگشت نے میاں آزاد کو مخاطب کرکے کہا کہ کیوں حضرت آپ کا اسم مبارک۔ یہ بولے میاں آزاد۔ وہ مسکرائے اور کہا کہ ماں واللہ آپ کے قد و قامت اور وضع قطع پر یہ نام موزوں ہے۔ آزادی اور آزادہ روی صورت سے برستی ہے۔ ملت کیا ہے۔

آزاد نے کہا ؎

از مذہبم مپرس نہ مومن نہ کافرم   من رسم ایں دیار ندانم مسافرم

حضرت بندہ مسلمان ہے اور مسلم ایمان ہے۔ پابند شرع۔ آپ کا اسم شریف جناب مولوی صاحب۔

مولوی صاحب۔ اسم شریف تو چھپر پر رکھئے۔ اس وقت مجھے افسوس کرنے دیجئے۔

آزاد۔ بسم اللہ آپ افسوس کر لیجئے بلکہ رو دیجئے۔ مگر سنئے تو سہی محرم الحرام کے دن قریب ہیں خوب پیٹ بھر کر رُو لیجئے گا ایسی بیتابی کیا ہے۔

مولوی صاحب۔ آپ مسلمان اور پابند شرع اپنے آپ کو بتلاتے ہیں اور ہوٹل میں جاکر شراب خانہ خراب استعمال میں لاتے ہیں عیاذاً باللہ۔ مرد خدا آخر انجام کی بھی فکر ہے یا سگ دنیا ہی بنے رہو گے۔

آزاد۔ قبلہ بس اب کیا کہوں بجز سکوت کے اور کوئی کلمہ زبان پر نہیں آنے پاتا۔ لاحول ولا قوۃ۔

مولوی صاحب۔ بے ادبی معاف۔ لاحول تو آپ اپنے ہی اوپر پڑھتے ہیں۔ آپ سے حرکت شیطانی ہی ایسی سرزد ہوئی مگر بحمداللہ کہ آپ کا نفس لوامہ آپ کو ملامت تو کرتا ہے۔

آزاد۔ مولانا خدا کی قسم۔ میں نے ہوٹل میں صرف کھانا کھایا مگر وہ اغذیہ جو شرع کی رُو سے حرام نہیں۔ پس نظر انصاف سے دیکھئے تو اس میں قباحت ہی کیا ہے۔ آخر روم میں بھی تو صغیر و کبیر اور بڑے بڑے علمار نحریر عیسائیوں کے ساتھ کھانا کھاتے ہیں۔ پھر یہاں ہندوستان کے مسلمان اس کو داخل گناہ کیوں سمجھنے لگے، میں نے کیا کفر کیا کہ مردود اور مطرود اور زندیق اور ملحد اور مرتد بنایا جاتا ہوں۔

مولوی صاحب۔ مجھے سنیے میں عرض کروں۔ ہوٹل میں جانا اہل اسلام کے لیے مستحسن نہیں۔ جو کھانا آپ نے ہوٹل میں چکھا ہے اگر باہر منگوا کر اور فرش بچھوا کر چکھتے تو چنداں مضائقہ نہ تھا گو یہ بھی معیوب تھا۔ مگر اس درجہ نہیں پھر آپ لاکھ قسمیں کھائیے' قرآن اٹھائیے' یقین کس ملعون کو آئے گا کہ آپ نے شراب نہیں پی یا سور کا گوشت نہیں کھایا۔ کاجل کی کوٹھری میں جو جائے گا منہ کالا کر کے آئے گا۔ کوئلوں کی دلالی میں ہاتھ کالے ہی ہوتے ہیں۔ رومی لاکھ عیسائیوں کے ساتھ لقمے لگائیں اور بے تکلفی سے کھائیں ہم کو تو ایسا نہ چاہیے۔ ہمارے رسوم کے خلاف ہے آپ کو روم میں رہنا ہے یا ہندوستان میں۔ روم کی بات روم کے ساتھ ہے۔ ہندوستان اور ہندوستانیوں کے خیالات کا تذکرہ ہے یا روم اور رومیوں کی عادات کا۔ آخر باہر بھی تو کباب، کلچے، شیرمال' پراٹھے' باقرخانی، روغنی روٹی' بسکٹ سب ہی کچھ بکتا ہے پھر وہاں کھانے میں کون بہتری تھی۔ مفت میں اپنے آپ کو نکو بنانا اور ہنسوانا کون سی دانائی ہے۔

آزاد۔ حضرت وہاں اول تو کھانا عمدہ اور لذیذ۔ دوسرے مقام صاف و شفاف۔ جس لطف سے ہم نے وہاں کھانا کھایا وہ یہاں کہاں، قلی کھڑا۔ صاف ستھرا پنکھا جھل رہا ہے۔ پلیٹیں صاف، میز شفاف' چار چار چپراسی خدمت کے لیے کھڑے ہیں۔ یہاں یہ باتیں کہاں، لاحول ولاقوۃ۔

مولوی صاحب۔ کھانا عمدہ تو آپ سمجھتے ہوں گے۔ باقی رہا پنکھا ایک پیسہ دے دیجئے۔ گھنٹہ بھر پنکھا جھلوا لیجئے اور صفائی کو مسافرت سے کیا کام سوائے ازیں یہاں بھی کوئی غلیظ شے نہیں ہے۔ یوں وحشت کی بات ہی اور ہے خیر حضرت آپ جانیں اور آپ کا کام جانے ؎

نصیحت گوش کن جاناں کہ از جاں دوست تر دارند
جوانانِ سعادت مند پند پیرِ دانا را

مانو یا نہ مانو۔ اس سے یہاں غرض نہیں۔ ماننا نہ ماننا آپ کے ہاتھ ہے ہم نے کہہ دیا۔

میاں آزاد نے اپنے دل میں سوچا کہ آج سے ایسی حماقت نہ کریں گے کہ ڈنکے کی چوٹ پر ہوٹل میں جائیں۔ اور مفت میں اپنے آپ کو ہنسوائیں یوں تو ہمیں اختیار ہے کہ چاہے ہوٹل میں جائیں یا جو کھائیں۔ مگر خاموشی کے ساتھ یہ نہیں کہ اسٹیشن بھر میں گھومتے پھریں کہ ع

ہم بھی ہیں پانچویں سواروں میں

خوجی۔ کیوں بھلا خیر۔ ایک ہمیں کو آپ اُتو بناتے تھے۔ اب تو ایک مولوی صاحب نے آپ کو قائل کر دیا۔ بات تڑے کی اور ہوٹل میں کھاؤ۔

———✕———

منشی سجاد حسین

کاکوری کے ایک خوش حال خاندان کے چشم و چراغ تھے آپ کے والد منصور علی صاحب ڈپٹی کلکٹر تھے۔ سجاد حسین ۱۸۵۶ء میں پیدا ہوئے ۱۸۷۳ء میں انٹرنس پاس کیا کچھ دن ایف۔ اے میں پڑھا پھر فیض آباد میں فوجی منشیوں میں اردو پڑھانے کی نوکری کری ۱۸۷۷ء میں اودھ پنچ کی بنیاد ڈالی۔ اودھ پنچ کو پہلے ہی سال کچھ سحر بیان جادو نگار اہل قلم نصیب ہو گئے ان میں سب سے زیادہ نمایاں نامہ نگار یہ تھے۔ تربھون ناتھ ہجر۔ مرزا مچھو بیگ ستم ظریف۔ نواب محمد خاں آزاد۔ اکبر حسین اکبر جج۔ احمد علی شوق۔ جوالا پرشاد برق۔ احمد علی کسمنڈوی۔ رتن ناتھ سرشار۔

سجاد حسین مذاق و ظرافت کے موجد تھے۔ لکھنؤ کی زبان کے مستند جاننے والوں میں تھے۔ انھوں نے زبان میں قابل قدر اضافہ کیا ہے۔ ان کا دامنِ شہرت مذہبی تعصب سے خواہ پالٹکس ہو خواہ لڑیچر ہمیشہ پاک و صاف رہا۔

ان کے طرز نگارش میں پہلی چیز بے باکی و آزادی خیال ہے۔ نہایت کھلے لفظوں میں ہر بات کہہ دیتے ہیں۔ کبھی کبھی عامیانہ الفاظ بھی استعمال کرتے ہیں مگر وہ اپنا مفہوم واضح کرنے کے لیے اور ہر جگہ روزمرہ کی بول چال کا

لطف بھی قایم ہے۔ ان کی خصوصیت یہ ہے کہ تشبیہ و استعارہ نہایت ظرافت آمیز طریقے پر کام میں لاتے ہیں جس سے دلکشی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اودھ پنچ میں ادبیت کے ساتھ ظرافت کی جو چاشنی تھی وہ کسی کو ابتک نصیب نہ ہوئی۔ ۱۹۱۵ء میں انتقال کیا۔

حاجی بغلول کی تقریر

الحاصل تب حضرت کی تعریف و توصیف سرگوشی کی حد سے گزر کر بلا اور ندبہ تک پہونچی۔ جملہ ہائے استفہامیہ کی کثرت ہوئی لوگ بھی امید سے زیادہ آچکے حضرت نے بلا اجازت صدرنشین و تقریر تمہیدی کرسی چھوڑی۔ جریب ٹیکی۔ عبا کے دامن آگے سے درست کیے۔ عمامہ نے سر سے سنبھالا۔ چہرے کی دم یعنی ریش مبارک پر گلدستہ کر کر ہاتھ پھیرا۔ جماعت پر نظر دوڑائی رومال سے منہ پونچھا۔ کھانسے کھنکھارے۔ جماہی لی۔ کئی دفعہ منہ کھولا اور بند کیا بآخر یوں تقریر شروع ہوئی۔

"اسپاچ یعنی اسپیچ"

کیا نام کہ بسم اللہ الرحیم (گھبراہٹ میں الرحمٰن کی تخفیف بول دی) انا البندہ کہتا ہے۔ یہ حقیر پر تقصیر کیا نام کہ شیخ فردوسی گلستان

میں کہہ گئے ہیں ؎

چناں قحط سالے شد اندر دمشق
کہ یاراں فراموش کردند عشق

(چیرز) آج کل کیا نام کہ پانی نہیں برستا (سکوت پانچ منٹ) قحط پڑ گیا ہے۔ بڑا افسوس ہے کچھ نہیں پیدا ہوا کھانے کو کہاں سے آئے بقول شخصے اونٹ کے منہ کو زیرا (چیرز) اس ملک سے برکت کی باتیں اٹھ گئیں نہ اگلی سی برساتیں ہوتی ہیں نہ گرمی ہوتی ہے نہ جاڑا اور نہ کیا نام کہ باپ کو بھائی بیٹے کو بہن دوست کو دوست نہیں پوچھتے (وقفہ تین منٹ) بھائیو غور کرو کون کون بات کہی جائے تم سب سمجھ دار ہو سمجھ جاؤ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ دوستی محبت بڑی عمدہ بات ہے اور اس میں شک نہیں ایک حد تک سب کو کرنا چاہیے۔ زمانہ بُرا لگا ہے کیا نام کہ دوست بُرائیاں کرتے ہیں قسم ہے اللہ پاک کی ہمارے ملک عرب میں غلہ تو کم ہوتا ہے مگر دوستی زیادہ ہوتی ہے وہاں کی کس کس بات کی تعریف کی جائے شام کے مُردے کو کب تک روئے (چیرز) کیا نام کہ بس دیکھ لیا سب کو اس ملک میں بڑی خرابیاں ہیں اسی سے دوستی و محبت کے نہ ہونے سے جنبش نہیں ہوتی۔ لوگ دوست کو بنا کر مزے لیتے ہیں اور جلا جلا کر لطف اٹھاتے ہیں اسی مارے (وقفہ سات منٹ) کیا نام کہ میں آپ سے کہوں بات یہ ہے۔ جو کہتے ہیں۔ خیال کرنا چاہیے۔ کیا نام کہ (وقفہ پانچ منٹ) ہاں تو میں کیا کہتا تھا؟ (ایک آواز)

(ایک آواز) آگے آئی آیت۔

منشی خوش وقت رائے۔ وہی دوستوں کا ستانا۔ ہاں تو اب لازم یہ ہے دوستی سب سے اختیار کرو۔ اگر فرض کرو کوئی دوست وغیرہ تمھارا کیا نام کہ بیمار ہو اس کے واسطے دوا لے آؤ۔ حکیم طبیب لاؤ۔ ڈاکٹر۔ ڈاکٹروں کو بلاؤ۔ اگر اس کے کہیں درد ہوتا ہو تو تمھارے بھی وہیں درد ہونا چاہیے" ؎

درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لیے کچھ کم نہ تھے کرّوبیاں

(چیرز) بھائیو دل میں درد پیدا کرو۔ اور کیا نام کہ یہی بات آج کل نہیں ہے اور ہم بُری حالت کو پہونچے ہیں۔ آج کل زمانے کا رنگ کیا نام کہ بہت بگڑ گیا ہے۔ میں تم سے کیا کہوں تم سب لوگ دیکھتے ہی ہو (وقفہ تین منٹ) اخلاق جو ہے کیا نام کہ نکلا ہے خلق سے اور اس کو ہمارے ملک عرب میں بولتے ہیں اس کے معنی ہیں۔ میں آپ کو سمجھاؤں۔ اچھی طرح لوگوں سے پیش آنا کوئی کام ایسا نہ کرنا جس سے کسی کو رنج ہو۔ بھائیو اپنا تو اللہ پاک کی مرحمت (مرحمت) (چیرز) سے یہی طریقہ رہا (وقفہ دو منٹ) اگر تم میں یہ بات نہیں ہے تو تم دوستی کے لائق نہیں کہتے ہیں دوست لہو کی جگہ پسینہ گراتا ہے اُس کی کٹی انگلی پر موتا ہے (چیرز) یوں تو مولوی لوگ وعظ میں مسجد کہا کرتے ہیں (چیرز) حرام حدیث بہت بناتے ہیں

مگر کوئی خس برابر پروا نہیں کرتا دنیا مکاری کی رہ گئی۔ اسی مارے
کیا نام کہ پانی نہیں برستا کھانے کو نہیں ملتا۔ میں آپ سے کہتا ہوں
یہ تو اپنی کلہاڑی میں پاؤں مارنا ہے اس میں بنیوں کا کیا قصور
اور برسات پر کیا الزام دمڑی کی ہانڈی گئی کتے کی ذات پہچانی
(چیرز) (وقفہ چار منٹ) بھائیو! یہاں ملک میں تم کو نجات
نہیں مل سکتی اگر پیٹ کو کپڑا۔ تن کو ٹکڑا چاہتے ہو تو نکل جاؤ۔
کیا نام کہ کسی اور ملک میں پھر تم کو کوئی نہ دیکھے گا کہ کیا کرتے
ہو اور ایک بات اور ہے۔ یہ لوگ اوروں کی پسند کی ہوئی چیز پر
بہت لپکتے ہیں یہ بات نیلام نے پیدا کر دی ہے تم سب کو چاہیے
سب ایک دم سے نیلام میں جانا گناہ سمجھو اس سے بڑے بڑے جھگڑے
پیدا ہوتے ہیں پھر بنیے بھی غلہ سستا کر دیں گے۔ جو تم سب ایک
ہو جاؤ اور دام نہ بڑھاؤ تو بنیوں کا اتنا پیٹ نہیں سب اناج
آپ ہی ہضم کر جائیں لیکن بنیے کی گون میں نو من کا دھوکا ہوتا ہے
(چیرز) آخر اس کے جورو بچے کہاں تک کھائیں گے کیا نام بقول
شخصے بنیا ہی اپنا گڑ چھپا کے کھائے (چیرز) اور جو کھائے گا اس کا
پیٹ اور پھول جائے گا۔ دمڑی کی نونگ بنیا کھائے یہ گھر رہے
کر جائے (چیرز) مجھے کہو تو کیا نام کہ اس مضمون پر سارا سارا
اسپاچ (اسپیچ) دیا کروں مگر زیادہ فریاد و تضیع اوقات ضرور نہیں۔
ناظر حسین۔ بیشک۔

حاجی۔ پھر کیا نام کہ اس میں کسی کو کلام ہو سکتا ہے؟
کیا نام کہ دیکھئے وکیل بیرسٹر لوگ ایک ادنیٰ سی بات کو
کتنا بڑھاتے ہیں اور مقدمے والوں کا کتنا روپیہ خراب کرتے
ہیں اور ایک بات اور کہوں۔
آتا جاتا کچھ نہیں کرنے چلے تقریر ہیں مقدمہ نہ سمجھتے ہیں نہ
بوجھتے اور صلاح دے دیتے ہیں۔ مقدمہ چوپٹ کرا دیتے ہیں بلکہ
عرضی دعویٰ تک صحیح لکھنا نہیں جانتے۔ مال کا ہارے گال کا جیتے
خدا کی عنایت سے ایک دفعہ اس ناچیز حاجی کو اتفاق ہوا۔ پس ایک
صاحب نے ایسا ڈبویا کہ تھاہ نہ ملی۔ کیا نام کہ کتا چڑھے اونٹ
کاٹے (وقفہ تین منٹ) پس یارو! ان سے دور بھاگو۔ یہ سب روپیہ
کھا لیتے ہیں۔ آدمی غلّہ کہاں سے لے۔ سب تو سوت نہ کپاس کولی
سے لٹھم لٹھا کرتے کرتے خرچ ہو جاتا ہے (وقفہ سات منٹ) کیا نام
کہ خدا نے قرآن میں فرمایا ہے۔ میں تمہارا رازق ہوں وہ تو کھانے کو
دے ہی گا۔ سب کچھ کھانے کو پیدا کیا۔ گیہوں۔ مٹر۔ جو۔ چنا۔ اناج
اور میوہ۔ ترکاری۔ گھاس۔ پھوس۔ جنگل۔ پہاڑ۔ دریا۔ شیر۔ بھیڑیے۔
چیتے۔ لومڑی۔ کتا۔ بلّی۔ تو کس کس سے انکار کر سکتے ہو۔ شکر کرو کیا
نام کہ شکر ہ

ادیم زمین سفرۂ عام اوست
بریں خوان یغما چہ دشمن چہ دوست

اور اُس نے تمھارے واسطے کیا نام کہ گھر بار محل۔ کھپر چھپر یل (چھپر کھپریل) جھونپڑے مچان۔ بھٹ۔ بانبی سب دیے ہیں رہو اور اُس کی نعمتوں پر شکر بھیجو" (وقفہ لامتناہی) کچھ تو اس معقول تقریر زعفران زار کشمیر کے اثر اور کچھ طول طویل سکوت سے لوگ سمجھے چلتی گاڑی میں روڑا اٹکا۔ اسپیچ تمام شد۔ کار حاجی نظام شد۔ چند منٹ انتظار کر کے کئی جلد باز اٹھ کھڑے ہوے اور باوجود حاجی صاحب کی "ہاں، ہاں" کے جلسہ خود ہی برخاست ہوگیا۔ کرسیوں بنچوں کی چرخ چوں سے حاجی کو وحشت لوگوں کے اس طرح اٹھ کھڑے ہونے پر بے حد نفرت ہوئی۔ خیالات میں پراگندگی۔ زبان میں لکنت آئی۔ اور بڑی بات یہ کہ دو ایک نے یہ صدا سُنائی۔ حضرت اب تکلیف نہ فرمائیے جلسہ برخاست ہوگیا" حاجی نے پھر ایک دفعہ ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرا صرۂ دماغ کے کونے سے ٹٹول ٹٹال، ایک آدھ ریزگی نکالی مگر نقادانِ سخن وصیرفیانِ اسپیچ فہم و فراست کے دیوالہ نکل جانے کے خوف سے دکان بڑھا چکے تھے مجبور و ناچار سکۂ قلب کی طرح واپس دل ہی میں رکھ لی۔ اور داہنے بائیں نیچی نظروں سے دیکھتے۔ رومال سے منھ پونچھتے، مجمعے کو چیرتے نہایت ناخوش و برہم جلیٹھڑوں سے جان سے خفا اس طرح رفو چکر ہوے کہ دوست احباب۔ نیاز مند سب تلاش ہی کرتے رہے۔

غرضکہ وہ جلسہ جس کی اس قدر دھوم دھام تھی۔ جس کا اتنا اہتمام تھا اس طرح بخیر و خوبی تمام اور حاجی صاحب سامعین کی بے ادبی۔ نالائقی۔ نافہمی۔ بدتمیزی پر برافروختہ اپنی اس طرح خفت پر پشیمان۔ دوستوں کے اس سکوت پر جو عین موقع پر اُنھوں نے اختیار کیا اور کوئی اٹھ جانے والے کو نہ روکا بے حد ناراض۔ نہایت مضمحل و منقبض واپس تشریف لائے۔

کمبختی کہہ کے کچھ تھوڑی آتی ہے۔ کہیں میاں حرفہ ریوڑی نے بھی اتنا سن پایا تھا کوئی بڑا جلسہ ہے اور حاجی صاحب کے اہتمام و انتظام خاص سے آج کوئی معرکے کی بات ہے۔ معاملہ بے ڈھب معلوم ہوتا ہے۔ اِدھر حاجی صاحب کا گھر سے نکلنا۔ اُدھر اس جوان نے بھی سب چیزیں ٹھکانے رکھ دہیں کی راہ لی اور جب تک تقریر رہی یہ بھی آڑ میں کھڑا مزے لیتا رہا مگر واپسی کے وقت اتنی کسر رہ گئی کہ ہمارے حضرت گلیوں کوچوں کو جلدی جلدی طے کرتے پہلے ہو پہنچ گئے۔ اب ایک تو جلسے کی خفت سامعین پر جھلاہٹ اس پر ستم یہ کہ حرفہ ریوڑی بھی ندارد عبا زور سے اُتار کر پلنگ پر ڈال دی۔ عمامہ دُور پھینکا جب چہیت طلب منڈی کھوپڑی کے کھجلانے ہوا کھلانے سے فرحت ہوئی۔ پسینہ خشک ہوا۔ رہتی بدھنی سو گئی۔ فرع مجمہ سے انجرات تہ نشین ہوئے تو لے کے جریب اکڑے ہوئے دروازے پر دیکھتے

کیا ہیں میاں حرفہ ریوڑی سامنے سے لپکتے آرہے ہیں جوں ہی برابر پہونچے بے کہے سُنے تڑاق سے ایک جریب بھرپور رسید کی۔ "مردود۔ ناشدنا" کے دیباچے کے ساتھ دس بیس جملے جن میں حرفہ ریوڑی کی ماں کے واقعی اور غیر واقعی حرکات کا حوالہ تھا آؤ بھگت میں صرف کیے۔ قطعی حکم لگا دیا اگر آیندہ سے یوں غیر حاضر ہوگا تو اس کے ہفتاد پشت کی خیر نہیں۔ میاں حرفہ ریوڑی اس وقت تو موقع مناسب سمجھ کر کھا بدے مگر دوسرے وقت قدموں پر گرے بہت کچھ رُوئے اور ایک عدد عمامہ ماں کے دوپٹے کو اور موازی ایک عدد کرتہ جو کنگی اور دھوبی کے دستبرد سے تنزیب کے درجے کو طے کرکے کینچلی اور جالی کی حالت تک ترقی کر گیا تھا اپنے واسطے انعام میں اینٹھ لائے۔

عبدالحلیم شرر

پیدایش لکھنؤ ۱۸۶۰ء وفات لکھنؤ ۱۹۲۶ء

ان کے والد حکیم تفضل حسین صاحب واجد علی شاہ کے ملازم تھے آٹھ برس کے سن میں یہ کلکتہ چلے گئے۔ ابتدائی کتابیں اپنے والد سے پڑھیں منطق و فلسفہ مولوی علی حیدر صاحب نظم طباطبائی سے پڑھی ۱۸۷۰ء سے مستقلاً لکھنؤ میں رہنے لگے اور مفتی محمد عباس صاحب مرحوم سے عربی پڑھی ۱۸۷۹ء میں دہلی گئے وہاں تکمیل کر کے ۱۸۸۰ء میں نولکشور پریس میں اودھ اخبار کے اسسٹنٹ اڈیٹر ہو گئے۔ ۱۸۸۷ء میں خود ایک اخبار "محشر" نکالا ۱۸۹۱ء میں حیدرآباد گئے۔ اور وقارالامراء کے بیٹے کے ساتھ انگلستان گئے۔ ۱۹۰۰ء میں حیدرآباد میں ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم ہو گئے۔ دسمبر ۱۹۲۶ء میں انتقال کیا۔ فرانسیسی زبان بھی انگلینڈ میں سیکھی تھی۔

تاریخی اور عشقیہ ناول میں شاعرانہ خیالات کا اظہار کرتے ہیں قدرتی مناظر و دلی جذبات کو دلپذیر طور سے ادا کرتے ہیں۔ ہر جگہ مشرقی تمدن و معاشرت کو مغربی انداز سے ادا کیا ہے۔ ناول نویسی کی دنیا میں آپ کا نام بہت مشہور ہے۔ تاریخ سندھ۔ فلورا فلورنڈا ماہ ملک فردوس بریں آپ کی بہترین ناول ہیں اور مضامین شرر کی تمام جلدیں آپ کی قابل قدر تصانیف ہیں۔

غریب کا چراغ

ہائے دیکھو کس طرح ٹمٹما ٹمٹما کے جل رہا ہے۔ اس کی ماند روشنی یا تو پرانے جھونپڑوں کی پھوس کی چھت اور چٹائی کی ٹٹیوں پر پڑتی ہے اور یا ان کھلے میدانوں میں جن پر ہمارے میدانِ آرزو کی طرح سناٹا چھایا ہوا ہے۔ ان میدانوں میں جگنوؤں کی مثل یہ چراغ دُور سے جھلملاتا نظر آتا ہے اور عجب حسرت بھرے جذب سے بہک کر جا نکلنے والوں کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ اے اس نئی روشنی کے جگمگاتے ہوئے لمپوں کے گرد بیٹھنے والو! تمھیں اس چراغ کی قدر نہ ہوگی۔ مگر ہائے بے تکلف چراغ، جس کی قدر کچھ اگلوں ہی کو خوب تھی تمھاری تیز روشنی والے لمپوں سے زیادہ مفید ہے۔ اس کے دونوں سین دیکھنے کے قابل ہیں۔

اس جھونپڑے کو دیکھتے ہو؟ کتنا مختصر ہے! بنانے والے نے اپنے نیچر کا احسان لینے میں بڑی بے پروائی کی ہے۔ کیونکہ اگرچہ چاروں طرف بہت جگہ خالی پڑی ہوئی ہے۔ مگر وہ زمین کا بہت ہی تھوڑا حصہ اپنے استعمال میں لایا ہے۔ ایک چراغ اندر ٹمٹما رہا ہے اور ٹٹیوں کی درزوں سے اس کی زرد زرد روشنی نکلتی ہے؛ اور باہر کی اونچی نیچی غیر مسطح زمین پر ایک سنہرے سینکیے کی وضع بنا دیتی ہے۔ یہ روشنی اس قدر ہلکی ماند اور دھیمی ہے کہ موسم سرما

کا کھرا بہت نزدیک ہی سے اس کا اثر مٹا دیتا ہے۔ اندر ایک چھوٹا سا خاندان زندگی بسر کر رہا ہے۔ جو نیڑے کا مالک یا اس خاندان کا جفاکش بادشاہ، چونکہ دن کو اپنا کام پورا کر چکا ہے اس لیے اطمینان سے ایک طرف بیٹھا حقّہ پی رہا ہے۔ اپنا فرض ادا کر چکنے کی خوشی دنیا کی سب خوشیوں سے بڑھی ہوئی ہے۔ وہی خوشی ایک دل کو روشن کر دینے والے نور کی مثل اس کے چہرے پر چمک رہی ہے۔ چار برس کا ناسمجھ بچّہ دن بھر کے بعد اپنے باپ سے ملا ہے اور اس شوق سے اس کی گود میں بیٹھا ہے، کہ کھیلتے کھیلتے جب آگے بڑھ آتا ہے، تو یک بیک پیچھے کھسک کے اچھی طرح بیٹھ جاتا ہے۔ چھ برس کی بھولی معصوم لڑکی سامنے بیٹھی ہے اور جہاں اپنے چھوٹے بھائی کی باتوں سے خوش ہو رہی ہے، وہاں اس پر حسد بھی کر رہی ہے کہ ابّا کی گود میں بیٹھا ہے یہ دونوں بچے اپنی پیاری اور میٹھی باتوں سے اس کے دن بھر کے تھکے اور مضمحل دل کو بہلا رہے ہیں۔ اور وہ ان کی بھولے پن کی حرکتوں میں اس دلچسپی سے غرق ہے کہ زندگی بھر کی فکریں بھولا جاتا ہے۔ اور ان سب باتوں پر طرہ یہ کہ ٹمٹماتے ہوئے چراغ کی دھندلی روشنی ننھے بچے کے خوش خوش، اور باپ کی صورت کی عاشق لڑکی کے بھولے اور باپ کے سطمئن چہروں پر پڑ رہی ہے۔ یہاں سے تھوڑی دُور ہٹ کر لڑکوں کی ماں اسی چراغ کے آگے ایک ٹوٹی چادر اوڑھے اپنے دوپٹے میں پیوند لگا رہی ہے۔ اور اس کے برابر ہی بڑی کنواری

لڑکی ٹوپی کاڑھ رہی ہے۔ یہ ٹوپیاں ایک شہر کے ٹھیکہ دار کی معرفت کاڑھنے کو مل جایا کرتی ہیں اور اُن کی اُجرت جو ہماری نظر میں نہایت حقیر ہے۔ اس خاندان کی روزی کا ایک حصّہ ہوا کرتی ہے۔ جھونپڑا بہت تنگ ہے۔ ہوا بہت رُک رک کے آتی ہے۔ سامان بہت ادنیٰ حیثیت کا ہے۔ رہنے والے غریب اور چھوٹی قسمت کے لوگ ہیں۔ اور ایسے ہیں کہ وہ ادنیٰ ادنیٰ فکریں، جن پر ہم توجہ نہیں کرتے ان کے دلوں پر بڑا سنگین اثر ڈال دیا کرتی ہیں۔ مگر یہ زرد زرد شعاعوں کا چراغ ان سب کے چہروں کو نہایت تازہ شگفتہ اور بشاش دکھاتا ہے۔ ننھے بچّے کی ناسمجھی کی باتیں، منجھلی لڑکی کا بھولا اور پیارا دلفریب چہرہ، جس پر بے فکری کے علاوہ سادگی کا روغن بھی بھرا ہوا ہے، بڑی لڑکی کا ایک متانت اور سنجیدگی کے ساتھ اپنے کام میں مشغول ہونا، اور اس کی نیچے کو جھکی ہوئی حسین اور عصمت شعار آنکھیں، باپ کا اطمینان اور بچّوں کی باتوں سے خوش ہو ہو کے ہنسنا، ماں کا اپنی غریبی کے لباس کا درست کرنا اور کفایت شعاری کے اصول کو بغیر کسی قسم کی افسردہ دلی کے برتنا، یہ سب ایسی دلفریب اور دلربا اور قیمتی چیزیں ہیں کہ اعلیٰ سوسائٹی اور رئیس پارٹی کے بڑے بڑے محل اور اونچی اونچی کوٹھیاں چھان ڈالو کہیں نہ نظر آئیں گی۔ موٹی بتیوں کی نفیس اور خوشگوار کرنوں میں عمدہ عمدہ قیمتی ولایتی لیمپوں کی آنکھوں کو چوندھیا دینے والی شعاعوں میں،

یہ سین کبھی نظر نہ پڑے گا۔ ہائے اس قسم کے سین نظر آئیں گے تو اسی دیسی چراغ کی مٹی مٹی روشنی اور زرد زرد شعاعوں میں!

پہلا سین تو دیکھا، اب دوسرے سین کی بھی سیر لو۔ اس میدان میں دیکھو ایک چراغ ٹمٹما رہا ہے۔ ہوا آہستہ آہستہ چلتی ہے اور اس کی لَو کو زیر وزبر کر رہی ہے۔ چراغ گویا گُل ہو ہو کے روشن ہوتا ہے اور روشنی مٹ مٹ کے نمودار ہوتی ہے۔ دُور سے دیکھنے والا مسافر کبھی جگنو سمجھ کے مایوس ہو جاتا ہے، اور کبھی غول کا خیال کر کے ڈرنے لگتا ہے۔ مگر باوجود ان سب باتوں کے وہ ڈر ڈر کے قدم اٹھاتا ہے اور اسی طرف بڑھتا چلا جاتا ہے۔

چراغ کی روشنی کبھی اپنی میلی کرنوں میں سیکڑوں جگنوے بڑھا دیتی ہے اور ہوا سے ہلتے ہوئے پتوں پر یہ کرنیں سیکڑوں جگنو چمکا دیتی ہیں اور پھر یک بیک یہ روشنی غائب ہو جاتی ہے۔ اور جنگل کا سناٹا اپنی معمولی خموشی اور تاریکی کی حالت پر آ رہتا ہے زیادہ آگے بڑھ کر مویشیوں خصوص بکریوں کی آوازیں سنتا ہے اور اُس کے دل کے خیالات اور شکوک یکایک غائب ہو جاتے ہیں۔ اب وہ زیادہ آرزو مند ہو کے تیز چلنے لگتا ہے اور اُس کم حیثیت جھلملاتے ہوئے چراغ کے پاس ہو پہنچتا ہے۔ اور دیکھتا ہے کہ ایک ٹٹی دو لکڑیوں کے سہارے پر ترچھی کھڑی ہے اور اس کے نیچے کوئی ایسا شخص بیٹھا ہے جس نے دنیا کی ساری خوشیوں اور تمناؤں

کولات مار کے اپنے سامنے سے ہٹا دیا ہے۔ کچھ بکریاں اور بھیڑیں سامنے روشنی کے رُخ پر اطمینان سے بیٹھی جگالی کر رہی ہیں، جن کے مُنہ کی حرکت سے دھندلی روشنی میں ہر وقت اپنے کام میں مشغول رہنے اور نیز اطمینان اور بے فکری سے زندگی بسر کرنے کا عجب طرح سے پتہ لگتا ہے۔ اس سے پیشتر مسافر صرف اپنے پاؤں کی آواز سنتا تھا، اب ان بے زبان جانوروں کی جگالی کرنے کی آواز بھی سنتا ہے یہاں کی ساری رونق اصل میں پوچھو تو صرف اس ایک ٹمٹماتے ہوئے چراغ سے ہے، جو ایک آوارہ گرد کو دُور سے کھینچ لایا ہے۔ مسافر کی چاپ پا کر وہ شخص اس کی طرف متوجہ ہوا اور دیکھتے ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ اس غریبی، اس بے سرو سامانی میں اور اس چراغ کی تاریکی آمیز روشنی میں اس شخص نے صرف کھڑے ہو کر خلق و مروّت کی وہ ادا دکھادی جو شاید دنیا میں اور کہیں نہ نظر آتی۔ مسافر نے سلام کیا اور دل میں اسقدر جوشِ مسرت پیدا ہوا کہ نہ ضبط ہو سکا۔ خود ہی دوڑ کے لپٹ بھی گیا۔

اب اس ٹیڑھی ٹٹی کے نیچے بیچ میں وہی چراغ جل رہا ہے جسے ہم نے غریب کا چراغ کہا۔ ایک طرف میزبان بیٹھا شگفتہ ہو ہو کے احوال پوچھ رہا ہے اور دوسری طرف مہمان بیٹھا ان ذلت کے سامانوں کی دلفریبیوں کو گھبرا گھبرا کے دیکھ رہا ہے۔ چراغ کی روشنی دو چہروں پر پڑ رہی ہے، جن میں دونوں بشاش ہیں۔ ایک کو ہم جنس ملا ہے اور قومی ہمدردی کا جوش اُسے خوش کر رہا ہے۔ دوسرے کو پناہ اور

آرام کی جگہ ملی ہے اور میزبان کے بے تکلفانہ اخلاق اُسے مسرور بنا رہے ہیں۔ اے دنیا کو غور سے دیکھنے والو! انصاف تمھارے ہی ہاتھ ہے۔ بھلا کبھی کسی شمع اور کسی لمپ کی روشنی بھی ایسے دور استباز اور صاف دل دوستوں کے چہروں پر پڑی ہوگی؟ کبھی نہیں وہاں تکلف کی راہ سے جس طرح چہرے زبردستی ضرورت سے زیادہ پُرتکلف بنائے جاتے ہیں، اُسی طرح صرف دکھانے کے لیے وہاں کے چراغوں کی روشنی بھی بہت تیز ہوتی ہے۔

غریب کا کم حیثیت چراغ دیکھنے میں تو بہت ذلیل ہے، مگر اصل میں دیکھو تو یہی وہ چراغ ہے جو پہلے پہل تہذیب کے راستوں میں روشن کیا گیا۔ اسی کی مدد سے تمام وہ جگمگاتی ہوئی روشنیاں ظاہر ہوئیں، جن کی جگمگاتی ہوئی کرنیں آج نظروں کو جھپکائے دیتی ہیں تمھیں اس کا صحیح اندازہ کرنا ہو تو تھوڑی دیر کے لیے اگلی دنیا میں چلے جاؤ اور گذرے ہوئے زمانے پر خیال کرو۔ تاریخیں تمھیں بہ سہولت پہونچا دیں گی۔ دنیا کے سب سے پہلے درباروں کو دیکھو گے تو شاہی تختوں کے آگے بھی یہی چراغ نظر آئے گا۔ تاج سلطنت کے جواہر بھی اسی چراغ کی دُھندلی روشنی میں جھلکتے دکھائی دیں گے۔ ذرا اور ادھر ہٹو گے تو نئی ری (عشرت پسندی) نے اس چراغ کو حقیر سمجھ کے درباروں سے نکلوا دیا ہوگا، کیونکہ مومی اور کافوری شمعوں کے ہوتے ہوئے دولتمند لوگ بھلا اسے کیوں پسند کرنے لگے تھے۔ مگر ہاں بڑے بڑے فلسفیوں

کے دماغ اور بڑے بڑے نازک خیالوں کے دل، اسی چراغ کے آگے بیٹھے غور کر رہے ہوں گے۔ سقراط اور افلاطون اور اسلام کے بڑے بڑے نامور فلسفیوں کے نازک دماغوں تک اسی چراغ کی شعاعیں پہونچ سکی ہوں گی، جو وہاں جھونپڑے کی رونق تھا اور یہاں صحرائے وحشت ناک کے پُر حسرت سین میں ایک کیف پیدا کر رہا ہے۔

وہ مجلّد کتابیں اور قدامت کے منتخب کارنامے جو زمانے کی امانت داری میں رہ کر ہم تک پہونچے ہیں، جن کو فلسفی اپنے ایمان سے کم نہیں جانتے، اور عقلمندوں کی دنیا جن کی ہمیشہ تعظیم کرتی آئی اور کرتی رہے گی، سب کے سب انہی ٹمٹماتے ہوئے مہین بتی کے چراغوں کے سامنے لکھے گئے ہیں، جنھیں آج اپنے بیہودہ غرور کی بدولت ہم نے اپنے گھروں سے نکال دیا ہے۔

اصل میں یہ عمدہ عمدہ شمعیں، جن سے آج کل کی نکھری صحبتوں کی رونق ہے لکژری (عشرت پسندی) کا بہت پُرخوف اور بُرا نمونہ ہیں۔ لکژری سے انھیں کچھ ایسا لزوم ہو گیا ہے کہ جہاں لکژری ہے وہاں یہ بھی ضرور ہیں اور جہاں یہ نہیں وہاں لکژری بھی نہیں۔ عشرت پسند اپنی قدیم آرزوئیں پوری کر رہے ہیں، قسمت انھیں کامیاب کرا رہی ہے۔ اگر انھوں نے غریب ایسی ٹمٹماتے چراغ کا ساتھ چھوڑا تو چھوڑنے دو، کیونکہ وہ بامراد ہیں، مگر اے شکستہ حال قوم تیری کون مُراد برآئی؟ کس مقصد میں کامیاب ہوئی ہے؟ جو تو نے بھی اپنے تئیں اسی قسم کی خوفناک لکژری میں ڈال دیا، جو آج تک سیکڑوں قوموں کو تباہ کر چکی ہے!

ڈاکٹر مرزا رسوا

مرزا محمد ہادی نام رسوا اور مرزا تخلص خلف آغا محمد تقی ۱۸۵۸ء میں بمقام لکھنؤ پیدا ہوئے۔ سولہ سال کی عمر میں سایۂ والدین سے محروم ہو گئے۔ ابتدائی تعلیم والد سے حاصل کر چکے تھے کہ انگریزی پڑھنی شروع کی اور انٹرنس پاس کر کے رڑکی سے اورسیری کا امتحان پاس کیا۔ بلوچستان میں ریلوے انجینیر ہو گئے۔ یہ لائن طبیعت کے خلاف تھی نوکری چھوڑ کر لکھنؤ آ گئے یہاں کیمسٹری پڑھنے کا شوق ہوا۔ لکھنؤ کے مشن اسکول میں بحیثیت مدرس فارسی ملازمت کر لی لیکن کیمسٹری پڑھتے رہے۔ پنجاب یونیورسٹی سے فارسی کا بڑا امتحان پاس کیا پھر پرائیوٹ بی۔ اے بھی پنجاب یونیورسٹی ہی سے کر لیا۔ وکالت کے امتحان میں بھی شریک ہوئے لیکن طبیعت نے وکالت اور انجینیری دونوں سے نفرت رکھتی تھی امریکہ کی اورینٹل یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی۔ اور پنجاب یونیورسٹی سے ڈی۔ او۔ ایل کی ڈگری حاصل کی۔ آپ متعدد زبانیں جانتے تھے۔ عربی۔ فارسی۔ یونانی۔ عبرانی۔ انگریزی۔ ہندی۔ سنسکرت اردو تو مادری زبان تھی منطق فلسفہ اور ریاضی میں کامل دستگاہ رکھتے تھے بہت اچھے شاعر تھے۔ قصیدہ میں مرزا اور غزل میں رسوا تخلص کرتے تھے

ان کا نظم کا کلام سب ضائع ہو گیا۔ نثر میں چند ناول موجود ہیں
جن سے ڈاکٹر صاحب کا نام زندہ جاوید ہو گیا ہے (انکےعلم ایک علمی
رسالہ کچھ عرصہ تک نکالا تھا) لیکن ان کا شاہکار "امراؤ جان ادا" ناول ہے
ڈاکٹر صاحب کی شہرت ان کی نثر نگاری سے ہے۔ لکھنؤ کی ٹکسالی
زبان پر قدرت کاملہ رکھتے تھے۔ روزمرہ اور محاورات بھی بڑی خوبی سے
استعمال کرتے تھے۔ سلاست ۔ ن ۔ ت طرز ادا کی برجستگی جذبات و خیالات
کی سادگی آپ کے کلام کی خصوصیات ہیں۔ طرز بیان میں
سادگی۔ صفائی۔ نرمی کے جوہر موجود ہیں۔ عبارت کا انداز ایسا ہے
گویا بات چیت کر رہے ہیں۔ اور پھر اس میں شگفتگی بدرجہ اتم
پائی جاتی ہے۔

حقیقت میں آپ کے ناولوں کا زمانہ عصر حاضر ہے مکان لکھنؤ
ہے اشخاص قصہ یا اہل لکھنؤ یا اہل جوار لکھنؤ ہیں۔ پلاٹ روزانہ
زندگی کے واقعات ہیں۔ جن میں فطرت و حیات انسانی کا گہرا
مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ ہر سوسائٹی کے آدمی کو لیا ہے اور اس کے
عیب و ہنر کو طشت از بام کر دیا ہے۔ "امراؤ جان ادا" اردو کا
پہلا ناول ہے جو ناول کی صحیح تعریف میں آتا ہے۔

امراؤ جان آدا

کان پور میں لکھنؤ کی بیگم کے مکان پر

بیگم کا مکان شہر سے کوئی گھنٹہ بھر کا راستہ تھا۔ ۶ بجے میں وہاں پہونچی۔ نہر کے کنارے ایک باغ تھا جس کے چاروں طرف مینڈ پر ناگ پھنی اور دوسرے خاردار درخت اس طرح برابر بٹھائے گئے تھے جس سے ایک دیوار سی بن گئی تھی۔ باغ کی قطعہ بالکل انگریزی تھی۔ تاڑ کھجور اور طرح طرح کے خوبصورت درخت قرینے سے لگائے گئے تھے۔ روشوں پر سرخی کٹی ہوئی تھی۔ چاروں طرف سبزہ تھا۔ جا بجا کنکروں کی پہاڑیاں سی بنی ہوئی تھیں۔ ان پر انواع و اقسام کے پہاڑی درخت پتھروں کے اندر سے اُگے معلوم ہوتے تھے۔ پہاڑیوں کے گرداگرد دوب جمائی گئی تھی۔ باغ میں ہر چہار طرف پکے بر ہے بنے ہوئے تھے ان میں صاف موتی سا پانی بہ رہا تھا۔ مالی نلوں اور فواروں کے ذریعے سے پانی دے رہے تھے۔ پتیوں سے پانی ٹپک رہا تھا۔ دن بھر کی دھوپ کھائے ہوئے پھولوں میں جواب پانی پہونچا۔ کیسے تروتازہ اور شاداب تھے۔

سال گرہ کی رسم کوٹھی میں ادا ہوئی۔ عورتوں کے گانے کی آواز آئی۔ باہر میں نے مبارکباد گائی۔ پھر آپ ہی آپ شام کلیان کی ایک

چیز شروع کر دی کوئی سننے والا نہ تھا۔ آپ ہی آپ گا یا کی پھر چپ ہو رہی۔ بیگم صاحب نے ایک اشرفی اور پانچ روپے انعام کے بھیجے تھوڑی دیر میں شام ہو گئی۔ چاند نکل آیا۔ چاندنی پھیلنے لگی۔ تالاب کے پانی میں ماہتاب کا عکس موجوں سے مل کر عجیب کیفیت دکھا رہا تھا۔

باغ کے کنارے پر ایک بہت عالیشان کوٹھی تھی۔ وسط باغ میں ایک پختہ تالاب بنا ہوا تھا۔ اس کے گرد ولایتی پھولوں کے نا ندے نہایت خوبصورتی سے سجے ہوئے تھے۔ اسی تالاب سے ملا ہوا ایک اونچا چبوترہ تھا۔ اس کے درمیان ایک مختصر سا ہوادار چوبی بنگلہ تھا۔ اس کے ستونوں پر رنگ آمیزی کی ہوئی تھی۔ اس تالاب میں نہر سے پانی گرتا تھا پانی گرنے کی آواز سے دل میں ٹھنڈک پہونچتی تھی۔ واقعی عجیب عالم تھا شام کا سہانا وقت۔ ستھری ہوا رنگ رنگ کے پھولوں میں مہک۔ ایسی فضا میں نے کبھی نہ دیکھی تھی چبوترے پر سفید چاندنی کا فرش تھا۔ مسند تکیہ لگا ہوا تھا۔ اس کے سامنے ہم لوگ بٹھائے گئے کوٹھی سے لے کر اس چبوترے تک گلاب کی بیلوں سے ایک چھتا سا بنا ہوا تھا معلوم ہوا کہ اسی راہ سے بیگم صاحبہ تشریف لاتی ہیں۔ سامنے چلمنیں پڑی ہوئی تھیں چبوترے پر سبز مردنگیں روشن ہو گئیں۔ مجھے گانے کا حکم ہوا میں نے کدارے کی ایک چیز شروع کر دی بڑی دیر تک گایا کی اتنے میں ایک مہری ہاتھوں میں دو سبز کنول لیے ہوئے باہر نکلی مسند کے سامنے رکھ دیے۔ سازندوں سے کہا تم لوگ وہ سامنے

شاگرد پیشہ میں چلے جاؤ کھانا بھیج دیا جائے گا۔ اب یہاں زنانہ ہوگا۔ جب وہ لوگ اٹھ گئے بیگم صاحب برآمد ہوئیں۔ میں تعظیم کے لیے اُٹھ کھڑی ہوئی انھوں نے مجھ کو قریب بلایا خود مسند پر بیٹھ گئیں مجھے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا میں تسلیم کرکے بیٹھ گئی گانے کے لیے حکم کی منتظر تھی اور بیگم صاحب کی صورت غور سے دیکھ رہی تھی ؎

حیرانیٔ نگاہ تماشہ کرے کوئی
صورت وہ روبرو ہے کہ دیکھا کرے کوئی

پہلے تو وہ باغ اور وہاں کی فضا دیکھ کے مجھے پرستان کا شبہ ہوا تھا مگر اب یقین ہو گیا کہ پری میرے سامنے گاؤ تکیے سے لگی بیٹھی ہے مانگ نکلی ہوئی ہے چوٹی کمر تک پڑی ہوئی سرخ و سفید رنگت اونچا ماتھا کھنچی ہوئی بھنویں بڑی بڑی آنکھیں جیسے گلاب کی پتیاں ملچھوئی ناک چھوٹا سا دہانہ پتلے پتلے نازک ہونٹ نقشے بھر میں کوئی چیز ایسی نہ تھی جس سے بہتر میرے خیال میں کوئی چیز آسکتی ہو اس پر اعضا کا تناسب اور ابھرا پن کس قدر خوشنما تھا سیکڑوں عورتیں میری نظر سے گذر گئیں مگر میں نے اس بلا کی صورت نہ دیکھی تھی۔ خورشید سے بہت جھجک ملتی تھی مگر کہاں خورشید کہاں وہ خورشید کی صورت میں پھر ڈومنی پنا تھا اس میں یہ امیرانہ رعب یہ تمکنت یہ بھاری پن دوسرے خورشید ان کے سامنے کسی قدر بھدی معلوم ہوتی تھی ان کا کامنی سا نازک چھریرا بدن

اس نے کہاں پایا۔ دو ہرے اس کی صورت پر آٹھ پہر اداسی برستی تھی جب دیکھو برو گن بنی تھی بیگم صاحبہ بہت ہی خوش مزاج معلوم ہوتی تھیں بات کرتی ہیں گویا منہ سے پھول جھڑتے ہیں ہر بات پر خود بخود ہنسے دیتی ہیں مگر کسی کو مجالِ کلام نہیں واقعی سادگی میں تکلف اور تمکنت کے ساتھ شوخی انھیں میں دیکھی دولتمندوں کی خوشامد سب کرتے ہیں مگر میں عورت ذات ہو کے کہتی ہوں کہ رئیسوں کی خوشامد بھی اگر بے غرض کی جائے تو کوئی عیب نہیں لباس اور زیور بھی اس صورت کے لائق تھا مہین بسنتی دوپٹہ کندھوں سے ڈھلکا ہوا کیچلی کا شلوکہ بپسا بھسا سرخ گوٹ کا پاجامہ۔ کانوں میں صرف یاقوت کے آویزے ناک میں ہیرے کی کیل گلے میں سونے کا سادہ طوق۔ ہاتھ میں سونے کے سمرئیں، بازوؤں پر نورتن پاؤں میں سونے کی بیڑیاں چہرے کی خوبصورتی لباس کی سادگی اور زیور کی مناسبت یہ سب چیزیں میری آنکھوں کے سامنے تھیں اور میں نقل حیرت بنی بیٹھی تھی بغور صورت دیکھ رہی تھی اور میری صورت تو جیسی کچھ ہے وہ اس وقت آپ کے سامنے ہے مگر یقین ہی کیجئے گا ان کی بھی توجہ سی اور طرف نہ تھی مجھ ہی کو دیکھ رہی تھیں دونوں طرف سے نگاہیں لڑی ہوئی تھیں میرے دل میں بار بار خیال آتا تھا مگر اس کے اظہار کا موقعہ نہ تھا کہوں تو کیونکر کہوں ایک مہری پس پشت کھڑی پنکھا جھل رہی تھی دو سامنے کھڑی تھیں

ایک کے ہاتھ میں چاندی کی لوٹیا دوسرے کے پاس خاصدان۔

اس کے بعد ادھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں۔ بیگم نے میرے گانے کی بہت تعریف کی اسی اثنا میں خاصہ والی نے آکر کہا کہ خاصہ تیار ہے بیگم نے کہا چلو کھانا تو کھا لو۔

میں۔ بہت خوب۔

بیگم مسند سے اٹھ کھڑی ہوئیں میں بھی ساتھ ہی اٹھی میرا ہاتھ پکڑ لیا مہریوں کو اشارہ کیا تم یہیں ٹھہرو ہم کھانا کھا کے یہیں بیٹھیں گے۔

میں۔ واقعی تو اس وقت کا سماں ایسا ہے کہ جانے کو جی نہیں چاہتا مگر حکم حاکم۔

بیگم۔ تو کیا کھانا یہیں منگوا لیا جائے۔

میں۔ جی نہیں۔ اچھا کھا کے چلے آئیں گے۔

بیگم۔ (ایک مہری سے) ان کے ساتھ کے لوگوں کو کھانا دلوا دیا گیا

مہری۔ (ہاتھ باندھ کے) دلوا دیا گیا۔

بیگم۔ اچھا انھیں رخصت کرو۔ ہم نے دوسرا مجرا معاف کیا۔ امراؤ جان کھانا کھا کے جاویں گی۔

اس کے بعد بیگم اور ہم دونوں کوٹھی کی طرف چلے ایک مہری آگے آگے فانوس لیے جاتی تھی۔ چپکے سے میرے کان میں کہا۔ مجھ کو تم سے بہت سی باتیں کرنا ہیں مگر آج اس کا موقع نہیں کل تو مجھے فرصت نہ ہوگی پرسوں تم صبح آنا اور کھانا یہیں کھانا۔

میں۔ مجھے بھی کچھ عرض کرنا ہے۔
بیگم۔ اچھا تو آج کچھ نہ کہو چلو کھانا کھالیں اس کے بعد تمھارا گانا سنیں گے۔
میں۔ سازندوں کو تو حضور نے رخصت کر دیا۔
بیگم۔ ہم کو مردوں کے ساتھ گانا اچھا نہیں معلوم ہوتا میری ایک خواص خوب طبلہ بجاتی ہے اس پر گانا۔
میں۔ بہت خوب۔

اب ہم کوٹھی کے پاس پہونچ گئے بہت وسیع کوٹھی تھی اور اس طرح سجی ہوئی تھی کہ شاہی کوٹھیوں کے دیکھنے کے بعد اگر کوئی کوٹھی دیکھی تو یہی دیکھی پہلے برآمدہ ملا اس کے بعد کئی کمروں سے ہو کر گذرے ہر ایک نئے طرز سے سجا ہوا تھا ہر ایک کمرہ فرش فروش اور شیشہ آلات ایک نئے رنگ اور نئے طرز کا تھا آخر ہم اس کمرے میں پہونچے جہاں دسترخوان چنا ہوا تھا دسترخوان پر دو عورتیں اور بھی منتظر تھیں ان میں سے ایک چھٹی نویس تھی۔ ایک مصاحب ان دونوں کا لباس بھی بہت ہی زرق برق تھا صورتیں بھی اچھی تھیں۔

دسترخوان پر کئی قسم کے کھانے پلاؤ۔ بورانی۔ مزعفر۔ متنجن۔ سفیدہ۔ شیر برنج۔ باقرخانیاں۔ کئی طرح کے سالن کباب، اچار مربے، مٹھائیاں دہی۔ بالائی غرضکہ ہر قسم کی نعمت موجود تھی۔ لکھنؤ سے نکلنے کے بعد آج

کھانے کا مزہ آیا بیگم ہر طرح کی چیز میرے سامنے رکھتی جاتی تھیں میں اگرچہ کسی قدر تکلف سے کھانا کھاتی تھی مگر ان کے اصرار نے ضرورت سے زیادہ کھلا دیا۔

بیسن دانی اور تسلہ آیا منہ دھو کے سب نے پان کھائے پھر اسی چبوترے پر جلسہ جما۔ اس جلسہ میں صرف بیگم صاحبہ تھیں چھٹی نویس مصاحبین۔ مغلانیاں۔ پیش خدمتیں۔ مہریاں۔ مامائیں۔ سب ملا کے کوئی دس بارہ عورتیں تھیں۔

بیگم صاحبہ نے حکم دیا کہ طبلہ کی جوڑی اور ستار اٹھا لاؤ ایک مصاحب جو طبلہ بجانے میں مشاق تھی بجانے لگی خود بیگم صاحبہ ستار چھیڑنے لگیں مجھے گانے کا حکم دیا۔

کھاتے کھاتے دس گیارہ بج چکے تھے جب ہم گانے کو بیٹھے ہیں، ٹھیک بارہ بجے کا وقت تھا۔ اس وقت وہ باغ جس میں بہت سا روپیہ صرف کر کے جنگل، و۔ پہاڑ کی گھاٹیوں کے نمونے بنائے گئے تھے عجیب وحشت ناک سماں دکھا رہا تھا ایک طرف چاند اس عالیشان کوٹھی کے ایک گوشے سے تھوڑی دور پر گنجان درختوں کی شاخوں سے نظر آتا تھا مگر اب ڈوبنے ہی کو تھا تاریکی روشنی پر چھائی جاتی تھی جس سے ہر چیز بھیانک معلوم ہونے لگی درخت جتنے اونچے تھے اس سے کہیں بڑے نظر آتے تھے ہوا سن سن چل رہی تھی۔ سرو کے درخت سائیں سائیں کر رہے تھے۔ اور تو ہر طرف خموشی کا عالم تھا مگر تالاب میں پانی گرنے کی آواز بلند

ہو گئی تھی کبھی کبھی کوئی پرندہ اپنے آشیانے میں چونک کر ایک بانگ
بول دیتا تھا یا شکاری جانوروں کے ہول سے جو چڑیاں اڑتی تھیں،
اس سے پتے کھڑک جاتے تھے یا کبھی کوئی مچھلی تالاب میں اچھل پڑتی تھی
مینڈھک اپنا بے تکا راگ گا رہے تھے، جھینگر آس دے رہے تھے سوائے
اس چبوترے کے جہاں دس بارہ جوان جوان عورتیں رنگ رنگ کے
لباس پہنے اور طرح طرح کے زیور سے آراستہ حلبہ جمائے بیٹھی تھیں اور
کوئی آس پاس نہ تھا ہوا کے جھونکوں سے کنول بجھ گئے تھے۔ صرف دو
مردنگوں کی روشنی تھی ان کے شیشے سبز یا تاروں کا عکس جو تالاب
کے پانی میں ہلکورے لے رہا تھا ہر طرف اندھیرا تھا طلسمات کا عالم
تھا وقت اور مقام کی مناسبت سے میں نے سوہنی کی ایک چیز شروع
کر دی اس راگنی کے بھیانک سروں نے دلوں پر اپنا پورا اثر کیا تھا۔
سب مبہوت بیٹھے تھے۔

مارے خوف کے باغ کی طرف دیکھا نہ جاتا تھا خصوصاً گنجان درختوں
کے نیچے اندھیرا گھپ تھا سب ایک دوسرے کی صورت دیکھ رہے تھے
گویا وہ جلسہ امن کی جگہ تھی اور جدھر نگاہ اٹھائے دیکھو ایک ہو کا
عالم تھا اوروں کا کیا ذکر خود میرا کلیجہ دھڑک رہا تھا دل ہی میں
کہتی تھی بیگم نے سچ کہا تھا بے شک یہ جگہ رہنے کے لائق نہیں ہے۔
اس اثنا میں گیدڑ کے بولنے کی آواز آئی اس نے اور بھی دلوں کو
ہلا دیا اس کے بعد کتے بھونکنے لگے اب تو مارے دہشت کے یہ حال تھا

کہ کسی کے منہ سے بات نہیں نکلتی تھی اتنے میں بیگم نے گاؤ تکیہ سے ذرا اونچی ہو کے اپنے سامنے کچھ دیکھا اور زور سے ایک چیخ مار کے مسند پر گر پڑیں اور سب عورتیں بھی اسی طرف دیکھنے لگیں میں بھی مڑ کے دیکھنے لگی۔

بیگم صاحبہ کو میں سمجھ چکی تھی کہ وہمی ہیں مگر اب جو دیکھتی ہوں تو ان کے وہم کی حقیقت نظر آنے لگی۔ سامنے سے دس پندرہ آدمی منہ پر ڈھاٹے باندھے ننگی تلواریں ہاتھ میں دوڑتے چلے آ رہے ہیں عورتوں کے چلانے سے بیگم کے نوکر چاکر خدمت گار سب اس طرف کو چلے کوئی نہتہ کسی کے ہاتھ میں لاٹھی مگر ڈاکو زیادہ تھے۔ اور یہاں آدمی کم تھے کئی تو راستے سے فرار ہو گئے پانچ چار آدمی چبوترے تک پہونچ ہی گئے انھوں نے آ کر عورتوں کو بیچ میں کر لیا اور لڑنے مرنے پر آمادہ ہو کر کھڑے ہو گئے عورتوں میں سے کسی کو ہوش نہ تھا۔ سب غش کی حالت میں بے دم پڑی تھیں۔ ایک میں خدا جانے کیا پتھر کا دل تھا کہ بیٹھی رہی مارے ہول کے دم نکلا جاتا تھا "یا اللہ دیکھئے کیا ہوتا ہے۔"

* * *

مولانا راشد الخیری

مولوی نذیر احمد صاحب کے قریبی عزیز ایک معزز خاندان
کے چشم و چراغ ۱۸۶۸ء میں پیدا ہوئے ان کے والد نظام کی سرکار
میں محکمہ بندوبست کے افسر اعلیٰ تھے۔ عربی فارسی گھر پر پڑھی۔
عربک اسکول میں داخل ہوئے اور یہیں سے انٹرنس کا امتحان پاس
کیا۔ پھر بندوبست کے محکمہ میں کچھ دن کام کیا۔ ۱۹۰۵ء سے مستورات
کے لیے ماہنامہ "عصمت" نکالا جو اب تک جاری ہے۔

شروع سے آپ کو مسلمان لڑکیوں کی تعلیم و تربیت سے دلچسپی
رہی ان کی تمام تصنیفات میں یہ دلچسپی موجود ہے اور حقیقۃً اسی
دلچسپی نے آپ کو مصنف بنا دیا۔

ان کی مشہور تصانیف میں صبح زندگی۔ شام زندگی بہت مقبول
ہوئیں ان کی تصانیف کی تعداد ساٹھ سے متجاوز ہے۔ ۱۹۳۶ء میں آپ
نے انتقال کیا۔ آپ کی زبان خاص دہلی کی اردوئے معلیٰ ہے۔ جو انگریزی
الفاظ کی آمیزش سے بالکل پاک و صاف ہے۔ بیگمات کے محاوروں
پر عبور حاصل ہے اور محاورات کو آپ نہایت لطف سے استعمال کرتے
ہیں۔ الفاظ ملایم اور شیریں زبان سادہ اور شگفتہ۔ طرز بیان ایسا
صاف گویا باتیں کر رہے ہیں چھوٹے چھوٹے جملوں میں تاثیر کا طلسم

باندھتے ہیں آپ حزن و ملال کے بادشاہ ہیں۔ بیکسی کے مرقعے۔ یاس کی تصویریں۔ غم والم کے مناظر کو ایسے رقت آمیز الفاظ میں پیش کرتے ہیں کہ آپ کا لقب "مصورِ غم" ہو گیا ہے۔

گلستانِ زندگی

گلزارِ شیر خوارگی یہ ایک چھوٹا سا مگر خوشنما و شاداب باغیچہ تھا۔ مختلف عمروں کے آدمی مرد اور عورتیں بادِ بہاری کا لطف اٹھاتے پھر رہے تھے۔ صبح سعادت کا وقت تھا۔ گلہائے رنگین کی پیاری صورتوں نے زمین چمن کو بوقلموں کر رکھا تھا۔ شبنم نے موتیوں کے ہار بچھا دیے تھے۔ بادِ صبا فرحت و انبساط کے مژدے دیتی پھر رہی تھی۔ عورتوں کی گود میں چھوٹے چھوٹے بچے تھے مرد جوق جوق ہاتھ میں ہاتھ دیے ہنستے بولتے اِدھر اُدھر ٹہل رہے تھے۔ امیدوں نے اُن کے چہرے مالا مال اور دل چونچال کر رکھے تھے۔ ہرے بھرے گلزار آنکھوں کے سامنے لہلہا رہے تھے۔ زمانوں کے قدرتی چشمے کشتِ اُمید کو تر و تازہ کر رہے تھے۔ انتہائے نظر اور حدِ خیال تک چپہ چپہ اور ذرہ ذرہ شاداب دکھائی دیتا تھا وسط چمن میں ایک دودھ کی نہر لہریں لے رہی تھی۔ کیا بے فکری کا زمانہ تھا۔ مسافر وہی چھوٹے چھوٹے بچے بھوک لگی۔ کنارے پر آئے منہ

جھکایا اور سیر ہو گئے۔ ہاں کیا نعمت تھی کہ کلیجہ سے لگا کر دنیا بھر کی کلفت دُور ہو جاتی تھی۔ افکار و ملال خواب و خیال ہو جاتے تھے۔ رنج و غم غلط ہو جاتا تھا۔ کیا دولت تھی۔ جس کے مقابل ہفت اقلیم کی سلطنت ہیچ و بے وقعت تھی۔ بادشاہ وقت کا حکم اتنا مناسب تھا کہ ہر شخص مسافر نوازی اپنا فرض سمجھتا تھا۔ اگر کوئی اللہ کا بندہ اس خدمت سے محروم رہ جاتا تو اپنے تئیں نہایت بدقسمت تصور کرتا۔ کیا مبارک سرزمین تھی جو مرد نظر آیا شگفتہ جو عورت دکھائی دی وہ باغ باغ۔ عورتوں کے پرے کے پرے جس وقت مسافر کو گود میں لے کر گل گشت کو نکلتے تھے درختوں کی صدائیں بلند ہوتی تھیں۔

یہ محافظ و خبر گیر جو مسافروں کی خدمت پر متعین تھے ایسے اچھے لوگ تھے کہ سو طرح سے نثار تھے۔ ذرا مسافر کے پھانس لگی اور بیچین ہوئے ان لوگوں کی پیشانیاں ستارہ صبح کی طرح روشن تھیں۔ اور اُن کے دل برکت کے نور سے معمور۔ محبت کا سرمہ ان کی آنکھوں میں لگا ہوا تھا۔ اور خدمت گزاری کی روشنی اُن کے چہرو ں پر چمک رہی تھی۔ مکر کا نام نہ تھا۔ ریا کا کام نہ تھا۔ خالص محبت تھی اور سچی خدمت اللہ اللہ کیا لوگ تھے کہ جان تک دریغ نہ کرتے تھے خوش قسمت میزبان تھے کہ کامیابی کے ساتھ مہمانوں کی خدمت ختم کرتے تھے اگر کوئی مسافران کی خدمت ہی میں ہمیشہ کے واسطے رخصت ہو جاتا تھا

توڑ رہے تھے اور پیٹتے تھے، یہاں ایک بات دیکھ کر بہت ہی تعجب ہوا۔ بہت کم مسافر ایسے نظر آئے کہ خدمت محافظین کو مدِ نظر رکھا۔ اس خدمت کا معاوضہ تو خیر نا ممکن تھا جب وہ وقت آتا کہ وہ ان کے محتاج ہوتے تو آنکھ چرا جاتے۔ لذائذ نفسانی کے پابند ہو جاتے غیروں سے محبت کرتے۔ دوستوں سے اختلاط کرتے۔ خود محافظ ہو کر مسافروں کی خدمت کرتے۔ لیکن وہ خدمت فراموش تھے۔ جس کو سُنا یہ ہی کہتے ہیں، خدمت کرو تمہاری سعادت ہے نہ کرو کچھ شکایت نہیں۔"

منزلوں مسافروں کے ہمراہ جاتے اور حتی المقدور آنکھ سے اوجھل نہ ہونے دیتے۔ ہر منزل میں خدمت کرتے اور ہر مصیبت میں شریک رہتے ان میں بعض ناعاقبت اندیش ایسے بھی تھے جو عقل کی آنکھوں پر پردے ڈال لیتے تھے۔ اور درجہ محبت کو کمال پر پہنچا کر جا بے جا کا امتیاز کھو دیتے تھے اپنے بُرے اعمال اور ناقصِ افعال کا نمونہ دکھا کر مطلب اصلی خبط کر دیتے تھے اور پہلی ہی منزل سے مسافر بیچاروں کی باٹ مارنی شروع کر دیتے تھے۔

سرائے طفولیت سرائے طفولیت ایک عالی شان محل حیات آباد میں آسمان سے کھڑا باتیں کر رہا تھا۔ شہر کے ہر چہار طرف چونہ گچی کی پختہ عمارتیں بنی ہوئی تھیں سرائے کے دروازۂ خاص پر رنگ برنگ کے جھنڈے ہواؤں میں لہرا رہے

تھے۔ دیواروں کی گلکاریاں محرابوں کے نقش و نگار موسم بہار کا مزہ دے رہے تھے۔ رنگا رنگ کے جواہرات جڑے ہوئے جگمگ کر رہے تھے۔ لوگ خوشحال و فارغ البال نہ کوئی مفلس نہ کنگال بازار کشادہ و بارونق دکاندار خلیق و منکسر المزاج عجیب مقام تھا کہ ہر طرف بے فکری کے ڈنکے بج رہے تھے۔

سرائے کے اندر ہر طرف وسیع و پختہ کمرے بنے ہوئے تھے۔ بے فکری کا دور تھا۔ اطمینان و فارغ البالی کی حکومت تھی۔ امیری کا کارخانہ تھا۔ بادشاہت کا زمانہ تھا۔ محافظ زیادہ وہی تھے جو منزل اوّل میں تھے۔ مگر محبت کا ثمر پہلے سے بڑھ گیا تھا۔ مسافروں کی قدر و منزلت روز بروز زیادہ ہوتی جاتی تھی۔ کیا مبارک سرزمین تھی کہ رنج و غم پاس آکر نہ پھٹکتا تھا۔ ناعاقبت اندیشی انواع و اقسام کی نعمتیں ان کے دسترخوان پر چن دیتی تھی۔ کھیل کود کے خلعت گراں بہا زیب تن خوشی کا تاج سر پر لگائے ہوئے اِدھر اُدھر پھرتے تھے کیا دن تھے کہ پھر نہ آئے۔ اور کیا جگہ تھی کہ دوبارہ دیکھنی نصیب نہ ہوئی۔ بغض و حسد کا گذر نہ تھا۔ فکرِ معیشت کا پتہ نہ تھا۔ دولت و عسرت کا امتیاز نہ تھا۔ نخوت و غیبت کا نام نہ تھا۔ جو ضرورت ہوئی وہ رفع۔ جو خواہش ہوئی وہ پوری۔ ان کی بھولی بھولی باتوں اور سیدھے سادے معاملوں پر آسمانِ انصاف سے موتی برس رہے تھے۔ فراغت و اطمینان کا باغ خوشی و خرمی

کے پھول نچھاور کر رہا تھا۔ محبت و پیار کے ہار گلے میں پڑے تھے۔
کامیابی کے گلدستے طاقوں میں چنے ہوئے تھے۔ آرام و آسائش کی
بیلیں دیواروں پر چڑھی ہوئی تھیں غرض ہر قطع گلزار ارم
بنا ہوا تھا۔

محافظ و خبر گیر کیسے کیسے خدمت گذار کہ حکم کی دیر اور تعمیل
کو تیار۔ ایسے ایسے ناز بردار کہ ذرا سے اشارے پر جان نثار
کرنے کو آمادہ انتظام اتنا معقول کہ بڑے بڑے سرکش و تاجدار
مسافروں کے سامنے عاجز و لاچار رہتے۔ اس منزل کا تمام زمانہ
آزادانہ و بے باکانہ گذر گیا۔ ضرورت سے پہلے اور حاجت سے
پیشتر ہر چیز تیار اور موجود نہ کسی بات کا کھٹکا تھا نہ کسی قسم کا
خوف۔ نہ عزت کی خواہش تھی نہ دولت کا ارمان۔ نہ نخوت کے
اسباب نہ غرور کا سامان جو ملا وہ کھا لیا۔ جہاں نیند آئی وہاں
پڑ رہے۔ طبیعت میں شر نہ تھا۔ اور دل میں فساد نہ تھا۔

"کیا ہوگا" کا فکر نہ تھا۔ "کیا ہوگیا" یہ یاد نہ تھا۔ کوئی
بات خلاف مزاج ہوئی رو دیے۔ کوئی چیز اچھی ہاتھ آگئی
ہنس دیے۔ مگر طبیعتوں میں قبولیت کا مادہ موجود تھا۔ جو
سنتے تھے وہ کہتے تھے۔ جو دیکھتے تھے وہ کرتے تھے۔ نتائج سفر کا
دار و مدار اسی جگہ تھا ذرا سی لاپروائی بد سے بدتر
بنا دیتی تھی۔

چمنستانِ شباب

چمنستان شباب کی سرحد میں داخل ہوتے ہی طبیعت خود بخود شگفتہ ہونے لگی۔ ہوا کے فرحت بخش جھونکے دل دماغ کو تر و تازہ کرنے لگے۔ پھولوں کی تیز اور مست خوشبو سے کوسوں تک جنگل مہک رہا تھا۔ جوں جوں آگے بڑھتے گئے۔ دل میں اُمنگ اور خواہشیں پیدا ہوتی گئیں۔ پاس پہونچ کر دیکھا ایک خوشنما باغ دُور تک چلا گیا ہے۔ دروازے لگے ہوے ہیں۔ چار دیواری کھنچی ہوئی ہے۔ مگر اندر جانے کے واسطے اجازت عام ہے۔ کسی قسم کی روک ٹوک نہیں، آگے قدم بڑھایا تمام عالم سرسبز و شاداب نظر آیا۔ ہر قطعہ چمن بہشت بریں بنا ہوا ہے، رنگ برنگ کے پھول کھل رہے ہیں۔ خوشبوؤں نے ہوا اور ہواؤں نے باغ کو مہکا رکھا ہے۔ گلاب کے تختے پھیلے ہوے ہیں میٹھے اور ٹھنڈے پانی کے چشمے بہ رہے ہیں بار آور درخت جھنڈ کے جھنڈ جھوم جھوم کر زمین کو چوم رہے ہیں۔ طائران خوش الحان ڈالیوں پر بیٹھے چہکار رہے ہیں۔ ہرے بھرے درخت کھڑے لہلہا رہے ہیں پرند کلیلیں کر رہے ہیں گملے قطار در قطار چلے گئے ہیں کیلے کی چھاؤں دُور تک پھیلی ہوئی ہے۔ سنگ مرمر کے حوض بنے ہوے ہیں۔ رنگ برنگ کی مچھلیاں تیر رہی ہیں۔ وسط چمن میں ایک بارہ دری ہے۔ چنانچہ

کے پردے پڑے ہوئے ہیں مخمل رومی و کاشانی کا فرش بچھا ہوا ہے۔ کنیزان مہر وش سر سے پاؤں تک جواہرات میں ڈوبی زرق برق لباس سے آراستہ پیراستہ اِدھر اُدھر پھر رہی ہیں۔

سرائے طفولیت کی طرف سے مسافر جاگے دوڑے چلے آرہے تھے کہ گویا اب تمام عمر یہ فرحت و شگفتگی ان کا ساتھ نہ چھوڑے گی اس سرزمین کی ہر چیز میں کچھ ایسا مقناطیسی اثر تھا کہ دل خود بخود کھنچا چلا جاتا تھا۔ دو چار صورتیں ایسی بھی دکھائی دیں۔ جنھوں نے اس بات کا پتہ لگایا کہ دلفریب جلوے عارضی و فانی ہیں۔

غور سے دیکھا تو درحقیقت تمام چمنستان ایک جادو کا کارخانہ تھا۔ گلاب کے پودے کانٹوں سے پٹے پڑے تھے۔ چنبیلی کے پھولوں میں شہد کی مکھیاں چھپی بیٹھی تھیں۔ بیلوں میں سانپ بچھو لپٹے ہوئے تھے، چشموں کا پانی دیکھنے میں صاف پینے میں زہر ہلاہل۔ چور۔ قزاق۔ گرہ کٹ۔ اٹھائی گیرے آنکھوں کے سامنے پھر رہے تھے، اور اپنے فن کے ایسے کامل ہوشیار کہ کیسا ہی تجربہ کار آدمی کیوں نہ ہو۔ بات کی اور گرفتار ہوا۔ نشے کا سا عالم تھا۔ جو نظر آیا وہ بے خود و سرشار دیواروں پر خوبصورت تصویریں بنی ہوئی تھیں۔ مگر تصویر ایک دام تزویر تھا۔ ذرا آنکھ اٹھا کر دیکھا اور گلے کا ہار ہوئی۔ جو چیز

تھی دیکھنے میں کچھ، برتنے میں کچھ۔ ہوا کے خوشگوار جھونکوں تک
میں سمیت ملی ہوئی تھی ذرا ہوا لگی اور مسافر کا کچھ کا کچھ ہوا۔
باغ کے اس طرف ایک بیابان تھا ڈھاکے کا جنگل کوسوں دُور
چلا گیا تھا۔ جانور صحرائی ہر طرف لپٹے ہوے تھے۔ درندوں کی
خوفناک آوازیں رات کو تمام جنگل گونج جاتا تھا۔ بھیڑیے
بسا اوقات اندر گھس آتے تھے۔ شیروں کے منہ کو خون لگا ہوا
تھا چیتے ہر وقت تاک لگائے رہتے تھے۔ ہاتھیوں کا غول بارہا
اِدھر سے اُدھر نکل جاتا تھا۔

چمنستان شباب کے پانی میں خاص طور پر یہ تاثیر تھی
کہ مسافر اپنی اصلیت کو بھول جاتا تھا۔ حرص و تمنا دامنگیر
ہوجاتی تھی خواہش و ارمان کا ہجوم ہوجاتا تھا۔ مزاج میں
نخوت آجاتی تھی۔ آنکھوں پر غفلت کے پردے پڑ جاتے تھے
حسن و عشق کی تصویریں دلوں کو مسخر کرلیتی تھیں۔ اتلاف حقوق
ظلم و تعدّی عادات ہوجاتے تھے خوفِ خدا غارت ہوجاتا تھا
خود غرضی کا جال ایک طرف بچھا ہوا تھا۔ علائق کی زنجیریں
دوسری طرف پڑی ہوئی تھیں۔ غرض از ابتدا تا انتہا چمنستان
اور بارہ دری ایک سانچہ تھا کہ مسافر کو ڈھالا اور
دوسری طرف پھینک دیا۔ گرفتارانِ بلا ہاتھ میں ہتکڑیاں
پاؤں میں بیڑیاں جکڑے ہوے اور کسے ہوے دھکے

کھا کھا کر باہر نکلتے تھے۔ زمانہ گذشتہ کی یادگار دو چار کلنک کے ٹیکے دس پانچ بدنامیوں کے تمغے باقی رہ جاتے تھے۔ گناہوں کی بھاری گٹھری سر پر ہوتی تھی مڑ مڑ کر دیکھتے جاتے تھے۔ مگر جو قدم اٹھتا تھا پھر پلٹ نہیں سکتا تھا۔

یہ لوگ اپنے پاؤں میں کلہاڑیاں مارتے تھے ورنہ خود چمنستان شباب کے واقعات اگر چشم بصیرت سے دیکھتے اور تامل صحیح کرتے تو اصلاح کو کافی تھے۔ بیمار پڑے ہوئے کراہ رہے تھے۔ مصیبت زدہ چیخ چلّا رہے تھے۔ قبرستان قبروں سے اور مرگھٹ کھوپڑیوں۔ ہڈیوں سے پٹ رہے تھے۔ کوئی ماں کے غم میں سوگوار تھا۔ کوئی باپ کے رنج میں بے قرار۔ کسی کی بہن چھٹ رہی تھی۔ کسی کا بھائی جدا ہو رہا ایک جوان بیٹی کو رُو رہا تھا۔ دوسرا بیٹے پر جان کھو رہا تھا۔ کوئی رُو رہا تھا۔ کوئی ہنس رہا تھا کہیں پیدائش، کہیں موت، کہیں چھٹی، کہیں برات۔ کہیں دن، کہیں رات۔ زمین سے لے کر آسمان تک ہر چیز رنج میں ڈوبی ہوئی۔ مرد مغموم، عورتیں متفکر۔ غرض جو تھا بڑھا ہو یا جوان حیران و پریشان۔ عظیم الشان محل ویران پڑے تھے سنگین و پختہ عمارتیں سنسان کھڑی تھیں۔ آبادی بے شمار تھی مگر ہر ایک اپنے دکھ درد میں گرفتار تھا۔ بہت

سے ایسے بھی تھے جن کو خدا نے ہرا عتبار سے مالامال کر رکھا تھا۔ عنایت ایزدی شامل حال تھی۔ صاحب اولاد تھے۔ فارغ البال تھے۔ مگر غور سے دیکھا تو رنج و آفات میں بال بال جکڑے ہوئے تھے۔ مساہلت و غفلت کی انگلیاں ان کے کانوں میں ٹھسی ہوئی تھیں، اور طمع و حرص کے پردے آنکھوں پر پڑے ہوئے تھے۔

عالم ضعیفی چمنستانِ شباب کے اُس کنارے پر حیات آباد سے ملا ہوا دریائے انحطاط لہریں لے رہا تھا لوگ کشتیوں میں بیٹھ بیٹھ کر پار اترنے کی کوشش کر رہے تھے۔ موجوں کے تھپیڑے، پانی کے گرداب، پہاڑوں کی چٹانیں، باد مخالف کے جھونکے، دھارے کے سامنے بھی مشکل سے آنے دیتے تھے۔ غفلت و لاپروائی کے ناخدا جب کسی بلا کا سامنا ہوتا ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جاتے مسافروں کی آنکھوں پر غفلت کے پردے پڑے ہوئے تھے، ساتھ کی کشتیاں برابر ڈوبتی چلی جاتی تھیں۔ اور اپنی بربادی کا خیال بھول کر نہ آتا تھا۔ حیاتِ ابدی کا تکیہ لگائے ہوئے ہوس داروں کے میٹھے ترانے سنتے چلے جاتے تھے۔ اختتامِ سفر کا کوئی وقت معین نہ تھا۔ زندگی کے تمام سامان کشتیوں میں موجود تھے۔ اور دنیا بھر کے

کار و بار ریائی میں ہو رہے تھے، عاقبت اندیشی کا گزر نہ تھا۔ انجام پر نظر نہ تھی۔ غرور کا سودا دماغوں میں سمایا ہوا تھا۔ طمع زر دستِ شفقت پھیر رہی تھی ذرائع ناجائز گود میں لوٹ رہے تھے۔ بے ایمانی کی گھٹا سروں پر چھائی ہوئی تھی۔ نام و نمود کے کہرے نے کوسوں تک تیرہ و تار کر رکھا تھا۔ ناپائداری دنیا کا ابر تلا ہوا سروں پر کھڑا تھا۔ مگر ہٹ دھرمی اور خود پسندی کی خوبصورت دیویاں آنکھ اُٹھانے کی مہلت نہ دیتی تھیں ریاکاری کا تلاطم برپا تھا۔ مکر و فریب کے گھڑیال منہ کھولے بیٹھے تھے۔ اتلاف حقوق کے بھنور جا بجا پڑے تھے۔ مگر یہ اُمید کے بندے "ہمچو ما دیگرے نیست" کے نعرے مار رہے تھے۔

چکبست

برج نرائن چکبست نام۔ کشمیری برہمن تھے۔ "چکبست" آپ کا خاندانی نام ہے۔ آپ کے بزرگوں کا وطن لکھنؤ ہے مگر آپ ۱۸۸۲ء میں فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ بچپن ہی میں لکھنؤ چلے آئے اور یہیں نشوونما ہوا۔ ۱۹۰۵ء میں آپ نے کیننگ کالج سے بی۔ اے پاس کیا ۱۹۰۷ء میں ایل۔ ایل۔ بی کرکے وکالت شروع کر دی۔ چند ہی سال میں خداداد قابلیت سے آپ کا شمار لکھنؤ کے ممتاز وکیلوں میں ہوگیا۔ ۱۲ر فروری ۱۹۲۶ء کو ایک مقدمہ کی پیروی میں رائے بریلی گئے تھے اسی دن لکھنؤ واپس آرہے تھے کہ رائے بریلی کے اسٹیشن پر دماغ پر فالج گرا، زبان بند ہوگئی اور وہیں اسٹیشن پر انتقال کیا۔

شاعری کا شوق آپ کو بچپن سے تھا۔ نو برس کے سن سے شعر کہنے لگے تھے۔ آتش۔ انیس اور غالب کے کلام کے شیدا تھے آپ نے کسی شاعر سے اصلاح نہیں لی بلکہ اساتذہ کا کلام پڑھ پڑھ کے ان ہی کی پیروی کی۔ چنانچہ آپ کی غزل میں آتش کا مذاق اور آپ کے مسدس میں انیس کی تقلید کا اثر نمایاں ہے۔

آپ نئے خیالات کو پاکیزہ اسلوب بیان اور چیدہ چیدہ پسندیدہ الفاظ میں نظم کرتے ہیں۔ آپ فقط شاعر ہی نہ تھے بلکہ ایک

بلند مرتبہ نثار اور ایک اچھے ناقد بھی تھے۔ آپ کی زبان لکھنؤ کی مستند ٹکسالی زبان تھی۔

پنڈت جی کے مضامین نثر جو "کشمیر درپن" و "زمانہ" اور "ادیب" وغیرہ میں وقتاً فوقتاً شائع ہوے وہ زیادہ تر ادبی تنقید سے متعلق ہیں۔

ادبی تنقید اردو دان حضرات کے لیے ایک نئی چیز ہے یہاں لکھنؤ اور دہلی کی رقابت۔ دو معاصر شعرا میں تقابل و توازن ہمیشہ ہوتا رہا مگر اصلی تنقید بہت شاذ و نادر لکھی جاتی تھی۔ گو مولانا آزاد مرحوم نے مغربی اصول پر تنقید کا دروازہ کھولا مگر دیگر اہل قلم اس کو نبھا نہ سکے۔ پنڈت برج نرائن صاحب چکبست نے تنقید کا نہایت صحیح اور اعلیٰ معیار مدنظر رکھ کر متین اور شگفتہ زبان میں ایک عمدہ نمونہ پیش کر دیا۔

تاریخ

موجودہ تہذیب کا یہ ایک علمی اصول ہے کہ دنیا میں جس قدر رسم ورواج یا علوم وفنون ہیں وہ ایک سلسلہ وار ترقی سے ظہور میں آئے ہیں فن تاریخ بھی اس حالت سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ ابتدائے آفرینش سے موجودہ زمانے تک یہ فن مختلف تہذیبوں کے مختلف سانچوں میں ڈھلتا چلا آیا ہے۔ ایک زمانہ وہ تھا کہ جب انسان کو دنیا میں آئے ہوئے بہت کم دن گزرے تھے۔ قدرت کے کارخانے اس کے لیے معمے سے کم نہ تھے۔ اس عالم حیرت میں اس کی نگاہوں کے سامنے جو حیرت انگیز نقشے گزرتے تھے وہ اس کے دل پر عجیب اثر پیدا کرتے تھے۔ مثلاً وہ دیکھتا تھا کہ کبھی دن بڑے ہوتے ہیں اور کبھی راتیں۔ کبھی چاند سورج سیاہی میں چھپ جاتے ہیں۔ کبھی سردی زور شور کے ساتھ اپنا رنگ دکھاتی ہے۔ کبھی گرمی کے موسم کی تپش حد سے زیادہ ترقی کر جاتی ہے۔ شروع میں وہ قدرت کے کارخانوں میں کوئی انتظام وترتیب نہیں پاتا تھا۔ ان انقلابات سے متاثر ہو کر وہ دنیا کی کیفیت تشبیہوں اور استعاروں کے رنگ میں ایک شاعرانہ طرز پر بیان کرتا تھا۔ اب بھی جو وحشی قومیں باقی ہیں ان کی گفتگو تشبیہ اور استعارے کے پیرایے میں ہوا کرتی ہے۔ مثلاً اگر کسی وحشی کو یہ کہنا ہو گا کہ فلاں شخص میرا

ہمسایہ ہے تو وہ یہ کہے گا کہ "اس کے گھر کی پتیاں میرے گھر میں اُڑ کر آتی ہیں۔"
چنانچہ زمانہ گذشتہ میں بھی وحشی قوموں کا یہی رنگ تھا۔ اس قسم کے
گیت یا نظمیں ہر ملک اور ہر قوم کی تاریخ میں موجود ہیں جن میں
وہ خیالات پائے جاتے ہیں جو کہ انسان کے دل میں ابتدائی تہذیب
میں پیدا ہوئے ہوں گے۔ مثلاً سیاروں کو ایک قسم کا دیوتا مانتا ہے
دریاؤں اور پہاڑوں کی عظمت و شوکت سے متاثر ہو کر ان کی
پرستش کرتا ہے اور جب اس کے جذبات دلی جوش میں آتے ہیں تو
وہ ان خیالات کو شاعرانہ طرز پر ادا کرتا ہے جو کہ نظموں یا گیتوں
کی شکل میں یاد رہ جاتے ہیں اور آیندہ نسلوں کو ایک ایسی تاریخ
کا کام دیتے ہیں جس سے اس وقت کی تہذیب اور ترقی کی حالت
آئینہ دار نظر آتی ہے ایسی نظموں وغیرہ کو جن کو انگریزی زبان میں
"مائی تھالوجی" کہتے ہیں خلاف عقل انسانی جان کر بالکل بے
وقعت نہیں سمجھنا چاہیے۔ ان سے کامل طور پر تاریخی واقعات کی
تشریح نہیں ہوتی لیکن اس وقت کی تہذیب کا بہ حیثیت مجموعی
اندازہ ہو سکتا ہے جس وقت کہ نظمیں تصنیف ہوئی تھیں۔ اور یہ
تصنیف ہے جو تاریخی تحقیقات کی حد سے کسی حالت میں باہر
نہیں ہے اس موقع پر یہ کہنا ضروری ہے کہ تاریخی صراحت دو
قسم کی ہوتی ہے۔ ایک تو خارجی واقعات کی تصریح ہے جو کہ موجودہ
سائنس کے اصول پر مبنی ہے۔ دوسرے جذبات انسانی کی توسیع

وترقی کی تشریح ہے۔ فن تاریخ کے ابتدائی کارناموں سے ہم خارجی واقعات کی تصریح عمل میں نہیں لاسکتے لیکن اس وقت کے انسانوں کے جذبات دلی اور عقائد کا رجحان نہایت آسانی سے دریافت کرسکتے ہیں۔ اور اس قسم کے تاریخی کارنامے ایک نہایت اعلیٰ علمی ذخیرے کا کام دے سکتے ہیں۔ یہ فن تاریخ کی ابتدائی منزل ہے۔

دوسری منزل میں اس دلچسپ فن نے ایک نئی صورت پکڑی جب کہ انسان ترقی کے میدان میں دس قدم اور آگے بڑھا، اس کا تجربہ وسیع ہوگیا، تو دل ودماغ کی پنہاں قابلیتیں ظہور میں آئیں۔ اس حالت میں تاریخ صرف ان جذبات وعقائد انسانی کی داستان نہ رہی جوکہ انسان کے دل میں محض قدرت کے عظیم الشان کارخانے کو دیکھنے سے پیدا ہوئے تھے بلکہ اس میں خارجی واقعات کو مثلاً انسانی کارناموں کو بھی دخل ہوتا گیا۔ لیکن یہ واقعات اصلی حالت میں نہیں بیان کیے گیے ہر روایت کے بیان میں خیالی عظمت وشوکت کو بہت کچھ دخل رہا۔ جو عظیم الشان انسان اس دَور میں پیدا ہوے ان کی تعریفات میں بہت سی داستانیں کہی گئیں۔ کچھ نظم میں کچھ نثر میں۔ مگر واقعات کی صراحت کا خیال بالائے طاق رہا۔ اس قسم کی داستانیں پڑھنے سے ہم کو ہزاروں تاریخی واقعات معلوم ہوتے ہیں مگر جیسا کہ پیشتر لکھا

گیا ہے۔ ہر واقعے کے بیان میں مبالغے کو بہت دخل ہے۔ مثلاً لڑائیوں کی داستانیں اس طرح لکھی گئی ہیں جنھیں عقل انسانی کبھی قابل اعتبار نہیں مان سکتی۔ یا اکثر عظیم الشان انسانوں کی تعریف میں مبالغہ درجۂ اعتدال سے گذر گیا۔ یورپ میں آرتھر[1]، ہرکولیز[2] وغیرہ ایسے قدیمی تہذیب کے عظیم الشان انسانوں کی مثالیں موجود ہیں جن کی بہادری اور روئیں تنی کی تعریف میں دریا بہا دیے گئے ہیں۔ ہندوستان میں مہابھارت[3] کے سورمیران کے جواب ہیں ان کی بہادری کی روایتیں جس طرز پر لکھی گئی ہیں ان سے صاف ظاہر ہے کہ کس قدر مبالغہ آمیز ہیں۔ مہابھارت کے ہرکولیز یعنی بھیم کی نسبت یہ روایت تحریر ہے کہ اس نے غصّے کے عالم میں ایک بہت بڑا درخت زمین سے اکھاڑ کر اپنے مخالف کی طرف اس طرح کھینچ مارا جس طرح کوئی تنکا اٹھا کر پھینک دے۔ گو بادی النظر میں یہ واقعہ خلافِ قانون قدرت معلوم ہو لیکن اصل میں یہ ایک بہادر قوی ہیکل شخص کی بہادری اور روئیں تنی کی مبالغہ آمیز تعریف ہے۔ اس اصول کو پیش نظر رکھ کر ہم اگر اس قسم کی حکایتوں کا مطالعہ کریں تو ہم بہت کچھ تاریخی واقفیت حاصل کر سکتے ہیں۔

---

[1] انگلستان کا ایک بادشاہ جو چھٹی صدی میں حکمراں تھا۔ [2] قدیم یونانیوں کا ایک پہلوان جس کو دیوتا کا رتبہ دیا گیا ہے۔ [3] قدیم ہندوستان کے دو شاہی گھرانوں کو، کورو اور پانڈو کی جنگ۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مبالغہ پسندی کی وجہ کیا ہے۔ حقیقت حال یہ ہے کہ دنیا میں بڑے بڑے لوگوں کی نسبت مبالغہ آمیز روایتیں مشہور ہو جاتی ہیں اور جس قدر زمانہ گزرتا جاتا ہے اس ذخیرے میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ جن خلاف قدرت کرشموں کا انھوں نے اپنی زندگی میں کبھی دعویٰ نہیں کیا انہی کا وہ مجموعہ بتلائے جاتے ہیں۔ مثلاً ہندوستان میں گوتم بدھ نے کبھی اوتار ہونے کا دعویٰ نہیں کیا بُت پرستی کے خلاف انھوں نے وعظ کہا لیکن برہمنوں نے ایک پران بنا کر ان کو اوتار کا اعزاز بخشا ہے اور ان کے مُریدوں نے ان کے مرنے کے بعد اُن کا بُت پوجنا شروع کر دیا ہے ع

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا

یا سیوا جی کی مثال بہت نزدیک زمانے کی مثال ہے یہ سب جانتے ہیں کہ سیوا جی انسان تھے۔ اس کے وقت کی قابل اعتبار تاریخ موجود ہے لیکن مہاراشٹ میں ایک فرقے کا یہ عقیدہ ہے کہ سیوا جی شیو جی کا اوتار تھا اور اس کی پیدایش ایک معجزے کے ذریعے سے ظہور میں آئی تھی۔ ان واقعات پر غور کرنے سے ثابت ہوتا ہے کہ انسان میں چونکہ عظمت و شوکت کی قدر کرنے کے جذبات قدرتی طور پر موجود ہیں اس وجہ سے مبالغہ آمیز روایتیں بڑے بڑے آدمیوں کی نسبت مشہور ہو جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ اکثر ان کی

پرستش ہونے لگتی ہے۔ ابتدائے تہذیب میں چونکہ یہ جذبات نہایت زور و شور کے ساتھ انسان کے دل میں پائے جاتے تھے اور اس کا عقیدہ غائبانہ روحانی قوتوں میں تھا لہٰذا اس زمانے میں جو عظیم الشان انسان گذرے ان کے مداحوں نے ان کو آسمان پر چڑھا دیا اور ان کی تعریف میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ وجہ یہ ہے کہ وہ لوگ مبالغہ پسندی کو عیب نہیں سمجھتے تھے ان کے نزدیک یہ ایک قسم کی عزت تھی کہ بڑے آدمیوں کی صفت میں مبالغے سے کام لیا جائے نیز وہ یہ سمجھتے تھے کہ بزرگوں کے کارناموں پر جس قدر خیالی وارنش کی جائے زیبا ہے۔ لہٰذا جب ہم اس قسم کی روایتیں پڑھیں تو ہم کو اس امر کا خیال لازمی ہے کہ ہم اصلی واقعات بجنسہ نہیں پڑھ رہے ہیں بلکہ ان واقعات کی وہ تصویر دیکھ رہے ہیں جس میں کہ بہت کچھ مبالغے کا رنگ بھرا ہوا ہے یہ فن تاریخ کی دوسری منزل کی حالت ہے۔ تیسری منزل کی سیر کا راستہ بہت کچھ صاف ہے یہ وہ زمانہ ہے جب کہ انسان کو تاریخ کی غرض سے تاریخ لکھنے کی حس پیدا ہوئی ابھی تک اس کا منشا محض جذبات دلی کا اظہار تھا یا بزرگوں کی عظمت کرنا نہ کہ تاریخ کی غرض سے تاریخ لکھنا۔ اب وہ زمانہ آیا کہ جب اس نے گزشتہ و موجودہ واقعات کو یکجا جمع کرنا شروع کیا۔ لیکن یاد رہے کہ اس وقت تک تاریخ نویسی کا

مذاق تکمیل پر نہیں پہونچ گیا تھا۔ اس زمانے کی تاریخیں محض واقعات کی فہرستیں ہیں نہ کہ ملک اور سوسائٹی کی حالت کی فلسفیانہ تفسیریں نیز اس وقت تک مبالغے کو تاریخی واقعات لکھنے میں بہت دخل تھا۔ ہیروڈوٹس[1] یورپ کا اس رنگ کا پہلا باقاعدہ مورخ ہے۔ اس نے اپنی تاریخ میں اکثر واقعات لکھے ہیں جو مبالغے سے پُر ہیں یا اسی زمانے کا ایک دوسرا مورخ ہے۔ اس نے صاف الفاظ میں لکھ دیا ہے کہ میں نے اصلی واقعات کے علاوہ بہت کچھ اپنی طرف سے اضافہ کر دیا ہے۔ جیسے فردوسی نے شاہنامے میں صاف طور پر لکھ دیا ہے کہ ؎

منش کردہ ام رستم پہلوان   وگرنہ یلے بود در سیستاں

ہندوستان میں تاریخ نویسی کا مذاق اس حد سے آگے ترقی نہ کر سکا۔ یہاں پُرانیں وغیرہ موجود ہیں جن کے پڑھنے سے تہذیب قدیم کا حال معلوم ہو سکتا ہے یا کشمیر کی تاریخ کا پتہ اب چلا ہے لیکن کوئی باقاعدہ تاریخ تمام ملک کی موجود نہیں اس میں شک نہیں کہ ہندوستان کے قدیم باشندوں نے مختلف علوم و فنون میں حیرت انگیز ترقی کی تھی جس کی ثنا و صفت میں یورپ کے محققین تر زبان ہیں لیکن فن تاریخ نے یہاں نشو و نما نہ پائی۔ اکثر حضرات کا یہ مقولہ ہے کہ مسلمانوں کے دوران حکومت میں اکثر

---

[1] یونان کا پہلا مورخ ۱۲

جابر اور متعصب فرمانرواؤں نے ہندوستان کی کتب تاریخی جلادیں مگر یہ خیال بالکل غلط ہے اور اس قابل نہیں کہ اس پر اعتبار کیا جائے۔ کیا وجہ ہے کہ ہندوستان کے فلسفے اور شاعری وغیرہ کا ذخیرہ تو اب تک موجود ہے مگر تاریخی کتابیں اس انتظام کے ساتھ جلائی گئیں کہ ان کی خاک بھی سرمے کے لیے نہیں ملتی۔ اصل وجہ یہ ہے کہ فن تاریخ نے اسی ملک میں زیادہ نشو ونما پائی کہ جس ملک میں نظام معاشرت پولیٹکل اصول پر تھا۔ یہاں دنیا سے زیادہ عقبیٰ کی فکر رہتی تھی۔ اس لیے فن تاریخ کو قابل اطمینان ترقی نہ ہوئی کیونکہ فن مذکور زیادہ تر دنیاوی کارناموں سے تعلق رکھتا ہے۔ اب فن تاریخ کی چوتھی منزل کا حال ملاحظہ ہو۔ جب انسان میں غور و فکر کی قابلیت نے ترقی کی اور وہ محض عادت کا غلام نہیں رہا تو اس نے واقعات کو صرف سرسری نظر سے دیکھنا ناپسند کیا بلکہ ان کی رفتار کا بہ حیثیت مجموعی اندازہ کرنا شروع کیا۔ عام اسباب سے عام نتائج اخذ کیے اور ان عام نتائج کی مدد سے چند عام اصول قائم کیے اور ان عام اصول کو پیش نظر رکھ کر واقعات کی رفتار پر ایک تنقیدی نگاہ ڈالی اس دماغی ترقی کے ساتھ نظام معاشرت کی سادگی میں بھی روز بروز فرق آتا گیا اور زندگی کی داستان پیچیدہ ہوتی گئی — اس حالت میں تاریخ جب لکھی گئی تو وہ محض واقعات کی فہرست نہ رہی بلکہ ان

واقعات کے اسباب و نتائج کی فلسفیانہ تشریح ہوگئی۔ اس قسم کی تاریخ نویسی کی بنیاد یورپ میں پڑی۔ اس میں شک نہیں کہ عربی فارسی وغیرہ میں اکثر مستند تاریخیں موجود ہیں مگر ان میں صرف سلطنتوں کے کمال و زوال کی داستانیں درج ہیں مگر سوسائٹی اور مذہب وغیرہ کے پیچیدہ مسائل کا ان میں ذکر نہیں ہے۔ یورپ میں سب سے پیشتر ملک اطالیہ میں مکے ولی[1] نے فلسفیانہ تاریخ کی داغ بیل ڈالی۔ اس کے بعد جرمنی انگلستان وغیرہ میں ایسے مورخ پیدا ہوئے جنھوں نے علاوہ معمولی واقعات کے سوسائٹی کے مختلف پہلوؤں پر تاریخ میں نقادانہ نظر ڈالی۔ آخر کار فرانس میں گیزٹ[2] نے تاریخ تمدن لکھ کر تمام دنیا کو حیرت میں ڈال دیا۔ غرض کہ رفتہ رفتہ فن تاریخ ترقی کرتا گیا۔ اور آخر کار تجربے سے یہ ثابت ہوگیا کہ فن تاریخ شاعری اور فلاسفی کا مجموعہ ہے۔ یعنی مورخ کامل وہی شخص ہو سکتا ہے جو کہ فلسفی کا دماغ اور مصور کا قلم رکھتا ہو۔ دماغ سے واقعات کا فلسفیانہ طور پر اندازہ کرے اور جادو کار قلم سے سوسائٹی کے انداز معاشرت کی تصویر کھینچے۔ لیکن ابھی تک غالباً یورپ میں بھی کوئی ایسا مورخ نہیں پیدا ہوا جس میں یہ دونوں وصف درجۂ کمال پر پائے جاتے ہوں

---

[1] Machiavelli

[2] Guizot

بالفعل وہاں فن تاریخ دو حصّوں پر منقسم ہے۔ ایک فرقہ ایسے مورخین کا ہے جنہوں نے واقعات کی تشریح اور ان کی فلسفیانہ تحقیقات اپنا حصّہ کر لیا ہے۔ دوسرا فرقہ تاریخی فسانہ نگاروں کا ہے۔ اس قسم کے مصنفین زمانہ ہائے دور دراز کی سوسائٹی کے طرز معاشرت کی تصویر افسانوں کے پیرایے میں کھینچتے ہیں۔ جو شخص کہ پورے طور سے تاریخی واقفیت حاصل کرنا چاہے اس کے لیے دونوں قسم کی تصانیف کی سیر ضروری ہے۔ ہمارے اُردو لٹریچر میں تاریخی تحقیقات کا ذخیرہ بہت کم ہے۔ یہ بھی انگریزی تہذیب و تربیت کا اثر ہے کہ اکثر بزرگوں کو تاریخ لکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ مثلاً شمس العلماء مولوی ذکاء اللہ صاحب نے اکثر تاریخیں لکھی ہیں مگر ان تصانیف میں اس نقادانہ لیاقت سے کام نہیں لیا گیا ہے جو کہ فن تاریخ کی شان میں داخل ہے مگر نہ ہونے سے یہ تصانیف بہتر ہیں۔ بیشک اُردو میں ایک ایسی کتاب موجود ہے جس پر کہ سچی تاریخ کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ اس کتاب کا نام "دربار اکبری" ہے اور اس کا لکھنے والا ہندوستان کا مشہور مصنّف محمد حسین آزاد ہے ؎

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لیے

"دربار اکبری" میں محض اکبر کے زمانے کے محاربات وغیرہ ہی کا ذکر نہیں ہے بلکہ اکبر کے زمانے کی سوسائٹی کا رنگ بھی دکھایا

لیا ہے۔ اس نامور مصنّف کی، نظم اُردو کی تاریخ "آب حیات"
کے نام سے یادگار ہے۔ یہ تاریخ بھی اپنے رنگ میں لاجواب ہے۔
علاوہ ان نامی مصنّفین کے اکثر حضرات نے چھوٹی چھوٹی تاریخیں
ہندوستان کے مختلف حصّوں کی لکھی ہیں اور ایک حد تک
کامیابی بھی حاصل کی ہے۔ مگر افسوس ہے کہ فن تاریخ کی
دوسری شاخ یعنی تاریخی فسانہ نگاری نے ابھی کچھ نشو و نما
نہیں پائی۔ یوں تو ایسے فسانہ نگاروں کا ایک فرقہ پیدا ہوگیا ہے
جو اپنے تیئں تاریخی فسانہ نگار سمجھتے ہیں۔ مگر ابھی تک ایک بھی
ایسا مصنّف نہیں پیدا ہوا جو کہ واقعی تاریخی فسانہ نگار کے
لقب کا مستحق ہو۔ میری نظر سے اکثر فسانے گذرے ہیں جن کی
لوح پر یہ لکھا ہوا تھا کہ "یہ تاریخی فسانہ ہے" مگر ایک افسانے
کے پڑھنے سے بھی اس زمانے کی سوسائٹی کے طرز معاشرت
کا پتہ نہیں چلتا تھا جس زمانہ کا ان افسانوں میں ذکر تھا۔
ان میں محض تاریخی واقعات درج کردیے گئے تھے۔ مگر ان کے
مصنّف زمانہ دیرینہ کے مُردہ قالبوں میں جان نہیں ڈال سکتے تھے

ایک افسانے میں جو کہ عرب کے متعلق تھا اور جس میں کہ ہزار
برس اُدھر کی تاریخ کا ذکر تھا، یہ واقعہ نظر سے گذرا کہ کسی شخص
نے کسی کو رجسٹری کرکے خط بھیجا۔ حالانکہ عرب میں اب تک

رجسٹری کا پتہ نہیں ہے[1]۔ ایک صاحب نے اپنی تاریخ میں کسی مغربی عورت کے حسن کی تصویر میں سیاہ اور چمکدار زلفیں بھی شامل کردی ہیں حالانکہ مغرب میں سنہرے اور گھونگھر والے بال ہوتے ہیں نہ کہ سیاہ اور چمکدار زلفیں۔ ایک بزرگوار نے اپنے تاریخی افسانے میں جو کہ راجپوتانہ کی سو برس ادُھر کی تاریخ سے تعلق رکھتا ہے راجا کے محل میں مختلف آرائشوں کے علاوہ اپنے دماغ سے گیس کی روشنی بھی پیدا کردی ہے۔ حالانکہ اس زمانے میں گیس کی روشنی کہاں۔

---

[1] چکبست نے جب یہ مضمون لکھا تھا اس وقت تک عرب میں رجسٹری کا طریقہ رائج نہ تھا۔

منشی پریم چند

اصل نام دھنپت رائے "پریم چند" لقب ہے۔ ۱۸۸۰ء
میں بنارس کے قریب پیدا ہوئے سات آٹھ برس فارسی کی تعلیم
حاصل کرکے آپ نے بنارس کے کالیجیٹ اسکول سے انٹرنس
پاس کیا۔ (سات برس کی عمر میں والدہ اور پندرہ برس کی عمر میں
والد کا انتقال ہو چکا تھا) کچھ دنوں کے لیے صیغۂ تعلیم میں ملازمت
کرلی تھی۔ آپ کی ادبی زندگی ۱۹۰۱ء سے شروع ہوئی جبکہ آپ نے
رسالہ "زمانہ" کانپور میں مضامین لکھنے شروع کیے۔ ۱۹۰۲ء میں
آپ نے پہلا ناول ہندی میں "پریا" لکھا۔

منشی صاحب چھوٹے چھوٹے قصے (SHORTSTORIES)
لکھنے میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ آپ کو دیگر ناول نگاروں پر اس واسطے
فوقیت ہے کہ آپ نے ہندوستانی دیہاتوں کے ہوبہو نقشے اور یہاں کے
کسانوں کے سچے سچے واقعات نہایت عمدہ طریقے سے بیان کیے ہیں
آپ کی تصانیف میں مبالغہ کہیں قریب نہیں آنے پاتا آپ کبھی سچائی
اور حقیقت سے علیحدہ نہیں ہوتے۔ عبارت میں بے حد آمد کا زور
ہوتا ہے لطیف استعاروں اور نادر تشبیہوں سے عبارت کی خوبی
اور بڑھ جاتی ہے ساتھ ہی ساتھ جذبات اور نفسیات انسانی کے

بھی پورے ماہر ہونے کی وجہ سے آپ کے کیریکٹر (اشخاص قصہ) نہایت خصوصیت کے ساتھ جیتے جاگتے انسان ہوتے ہیں۔ کلام میں کہیں ظرافت ہے تو بہت لطیف اور جہاں کہیں درد ہے تو اس کی ٹیسیں اثر سے بھری ہوئی۔ آپ کے خیالات سوشل اور پولیٹکل معاملات میں بہت سلجھے ہوئے ہیں۔ آپ ہندو مسلم اتحاد کے بڑے زبردست حامی ہیں۔ جس کی جھلک ان کے افسانوں میں نظر آتی ہے۔

عیدگاہ

رمضان شریف کے پورے تیس روزوں کے بعد آج عید آئی ہے کتنی سُہانی اور رنگین صبح ہے۔ بچّہ کی طرح پر تبسّم۔ درختوں پر کچھ عجیب ہریاول ہے۔ کھیتوں میں کچھ عجیب رونق ہے۔ آسمان پر کچھ عجیب فضا ہے۔ آج کا آفتاب دیکھو کتنا پیارا ہے۔ گویا دنیا کو عید کی خوشی پر مُبارکباد دے رہا ہے۔ گاؤں میں کتنی چہل پہل ہے۔ عیدگاہ جانے کی دھوم ہے۔ کسی کے کرتے میں بٹن نہیں ہیں سُوئی تاگا لینے دَوڑا جا رہا ہے۔ کسی کے جوتے سخت ہو گئے ہیں اسے تیل اور پانی سے نرم کر رہا ہے۔ جلدی جلدی بیلوں کو سانی پانی دے دیں عیدگاہ لوٹتے لوٹتے دوپہر ہو جائے گی۔ تین کوس کا پیدل راستہ پھر سیکڑوں رشتہ قرابت والوں سے ملنا ملانا۔ دوپہر سے پہلے لوٹنا غیر ممکن

ہے۔ لڑکے سب سے زیادہ خوش ہیں۔ کسی نے ایک روزہ رکھا، وہ بھی
دوپہر تک، کسی نے وہ بھی نہیں، لیکن عیدگاہ جانے کی خوشی ان کا
حصّہ ہے۔ روزے بڑے بوڑھوں کے لیے ہوں گے۔ بچّوں کے لیے تو
عید ہے۔ روز عید کا نام رٹتے تھے۔ آج وہ آگئی۔ اب جلدی پڑی ہوئی
ہے کہ عیدگاہ کیوں نہیں چلتے۔ انھیں گھر کی فکروں سے کیا واسطہ؟۔
سویّوں کے لیے گھر میں دودھ اور شکر ہوئے ہیں یا نہیں اس کی انھیں
کیا فکر۔ وہ کیا جانیں ابا جان کیوں بدحواس گاؤں کے مہاجن چودھری
قاسم علی کے گھر دوڑے جا رہے ہیں، ان کی اپنی جیبوں میں تو قارون
کا خزانہ رکھا ہوا ہے۔ بار بار جیب سے اپنا خزانہ نکال کر گنتے ہیں۔
دوستوں کو دکھاتے ہیں اور رکھ لیتے ہیں۔ انھیں دو چار پیسوں میں
دُنیا کی نعمتیں لائیں گے۔ کھلونے اور مٹھائیاں اور بگل اور خدا جانے
کیا کیا۔ اور سب سے زیادہ خوش ہے حامد۔ وہ چار پانچ سال کا غریب
صورت بچّہ ہے جس کا باپ پچھلے سال ہیضہ کی نذر ہو گیا اور ماں نہ جانے
کیوں زرد ہوتی ہوتی ایک دن مر گئی۔ کسی کو پتہ نہ چلا کیا بیماری ہے۔
کہتی کس سے کون سننے والا تھا، دل پر جو کچھ گزرتی تھی سہتی تھی اور
جب نہ سہا گیا دنیا سے رخصت ہو گئی۔ اب حامد اپنی بوڑھی دادی امینہ
کی گود میں سوتا ہے اور اتنا ہی خوش ہے۔ اس کے ابا جان بڑی دور روپے
کمانے گئے ہیں۔ بہت سی تھیلیاں لے کر آئیں گے۔ امی جان اللہ میاں
کے گھر مٹھائی لینے گئی ہیں۔ اس لیے حامد خوش ہے امید تو بڑی چیز ہے

پھر بچوں کی امید۔ اُن کا تخیل تو رائی کے پربت بنا لیتا ہے حامد کے پاؤں میں جوتے نہیں ہیں۔ سر پر ایک پرانی دھرانی ٹوپی ہے جس کا گوٹا سیاہ ہو گیا ہے۔ پھر بھی وہ خوش ہے۔ جب اس کے ابّا جان تھیلیاں اور امّاں جان نعمتیں لے کر آئیں گی تب وہ دل کے ارمان نکالے گا۔ تب دیکھے گا محمود اور محسن، نور اور سمیع کہاں سے اتنے پیسے لاتے ہیں۔ دنیا اپنی مصیبتوں کی ساری فوج لے کر آئے اس کی ایک نگاہ معصوم اسے پامال کرنے کے لیے کافی ہے۔

حامد اندر جا کر امینہ سے کہتا ہے "تم ڈرنا نہیں اماں، میں گاؤں والوں کا ساتھ نہ چھوڑوں گا۔ بالکل نہ ڈرنا۔ لیکن امینہ کا دل نہیں مانتا گاؤں کے بچے اپنے اپنے باپ کے ساتھ جا رہے ہیں۔ حامد کیا اکیلا ہی جائے گا۔ اس بھیڑ بھاڑ میں کہیں کھو جائے تو کیا ہو نہیں امینہ اسے تنہا نہ جانے دے گی۔ ننھی سی جان تین کوس چلے گا۔ پاؤں میں چھالے نہ پڑ جائیں گے۔

مگر وہ چلی جائے تو یہاں سوئیاں کون پکائے گا۔ بھوکا پیاسا دوپہر کو لوٹے گا کیا اس وقت سوئیاں پکانے بیٹھے گی۔ رونا تو یہ ہے کہ امینہ کے پاس پیسے نہیں ہیں۔ اس دن فہیمن کے کپڑے سیے تھے آٹھ آنے پیسے ملے تھے اس اٹھنی کو ایمان کی طرح بچاتی چلی جاتی تھی اس عید کے لیے۔ لیکن کل گھر میں آٹا نہ تھا۔ اور گوالن کے پیسے چڑھ گئے تھے دینے پڑے۔ حامد کے لیے دو پیسہ کا روز دودھ تو لینا ہی پڑتا ہے۔ اب

کل دو آنے پیسے بچ رہے ہیں۔ تین پیسے حامد کی جیب میں اور پانچ امینہ کے بٹوے میں یہی بساط ہے۔ اللہ ہی بیڑا پار کرے۔ دھوبن، مہترانی اور نائن سب ہی تو آئیں گی۔ سب کو سوئیاں چاہئیں۔ کس کس سے منہ چھپائے گی اور منہ کیوں چھپائے؟ سال بھر کا تہوار ہے زندگی خیریت سے رہے اور ان کی تقدیر بھی تو اس کے ساتھ ہے۔ بچّے کو خدا سلامت رکھے یہ دن بھی یوں ہی کٹ جائیں گے۔

گاؤں سے لوگ چلے اور بچّوں کے ساتھ حامد بھی تھا۔ سب کے سب دوڑ کر آگے نکل جاتے۔ پھر کسی درخت کے نیچے کھڑے ہو ساتھ والوں کا انتظار کرتے یہ لوگ کیوں اتنے آہستہ آہستہ چل رہے ہیں۔

شہر کا سواد شروع ہو گیا۔ سڑک کے دونوں طرف امیروں کے باغ ہیں۔ پختہ چہار دیواری بنی ہوئی ہے۔ درختوں میں آم لگے ہوئے ہیں۔ حامد نے ایک کنکری اٹھا کر ایک آم پر نشانہ لگایا۔ مالی اندر سے گالی دیتا ہوا باہر آیا۔ بچّے وہاں سے ایک فرلانگ پر ہیں۔ خوب ہنس رہے ہیں۔ مالی کو کیسا الّو بنایا۔

بڑی بڑی عمارتیں آنے لگیں۔ یہ عدالت ہے۔ یہ مدرسہ ہے، یہ کلب گھر ہے، اتنے بڑے مدرسے میں کتنے سارے لڑکے پڑھتے ہوں گے لڑکے نہیں ہیں جی بڑے بڑے آدمی ہیں۔ سچ ان کی بڑی بڑی مونچھیں ہیں۔ اتنے بڑے ہو گئے ابھی تک پڑھنے جاتے ہیں۔ آج تو چھٹی ہے لیکن ایک بار جب پہلے آئے تھے تو بہت سے ڈاڑھی مونچھوں والے لڑکے

یہاں کھیل رہے تھے۔ نہ جانے کب تک پڑھیں گے اور کیا کریں گے اتنا پڑھ کر گاؤں کے دیہاتی مدرسے میں دو تین بڑے بڑے لڑکے ہیں۔ بالکل کند ذہن۔ غبی کام سے جی چرانے والے یہ لڑکے بھی اس طرح کے ہوں گے جی۔ اور کیا نہیں۔ کیا اب تک پڑھتے ہوتے۔ وہ کلب گھر ہے۔ وہاں جادو کا کھیل ہوتا ہے۔ سُنا ہے مُردوں کی کھوپڑیاں اُڑتی ہیں۔ آدمی کو بے ہوش کر دیتے ہیں، پھر اس سے جو کچھ پوچھتے ہیں وہ سب بتلا دیتا ہے اور بڑے بڑے تماشے ہوتے ہیں۔ مگر کسی کو اندر نہیں جانے دیتے اور یہاں لوگ شام کو کھیلتے ہیں۔ بڑے بڑے آدمی کھیلتے ہیں اور میمیں بھی کھیلتی ہیں۔ سچ۔ ہماری اماں کو وہ دے دو کیا کہلاتا ہے "بیٹ" تو اسے گھمانے ہی لڑھک جائیں۔

محسن نے کہا "ہماری امّی جان تو پکڑ ہی نہ سکیں ہاتھ کانپنے لگے اللہ قسم"!

حامد نے اس سے اختلاف کیا "چلو منوں کا آٹا پیس ڈالتی ہیں ذرا سی بیٹ پکڑ لیں گی تو ہاتھ کانپنے لگے گا۔ سینکڑوں گھڑے پانی رُوز نکالتی ہیں۔ کسی میم کو ایک گھڑا پانی نکالنا پڑے تو آنکھوں کے تلے اندھیرا آ جائے"۔

محسن۔ لیکن دوڑتی تو نہیں۔ اچھل کود نہیں سکتی۔

حامد۔ کام آپڑتا ہے تو دوڑ بھی لیتی ہیں۔ ابھی اس دن تمھاری گائے کھل گئی تھی اور چودھری کے کھیت میں جا پڑی تھی تو تمھاری

اماں ہی تو دَوڑ کر اُسے بھگا لائی تھیں۔ کتنی تیزی سے دوڑ رہی تھیں ہم تم دونوں ان سے پیچھے رہ گئے۔

پھر آگے چلے حلوائیوں کی دوکانیں شروع ہوئیں۔ آج خوب سجی ہوئی تھیں اتنی مٹھائیاں کون کھاتا ہے؟ دیکھو نہ ایک ایک دوکان پر منوں ہوں گی۔ سنا ہے رات کو ایک آدمی ہر ایک دوکان پر جاتا ہے اور جتنا مال ہوتا ہے وہ سب خود خرید لیتا ہے اور سچ مچ کے روپئے دیتا ہے بالکل ایسے ہی چاندی کے روپئے۔

محمود کو یقین نہ آیا۔ ایسے روپئے جنّات کو کہاں سے مل جائیں گے؟

محسن۔ جنات کو روپیوں کی کیا کمی۔ جس خزانے میں چاہیں چلے جائیں۔ کوئی انھیں دیکھ نہیں سکتا۔ لوہے کے دروازے تک روک نہیں سکتے۔ جناب آپ ہیں کس خیال میں۔ ہیرے جواہرات اُن کے پاس رہتے ہیں جس سے خوش ہو گئے اُسے ٹوکروں جواہرات دے دیے۔ پانچ منٹ میں کہو کابل پہونچ جائیں۔

حامد۔ جنات بہت بڑے ہوتے ہوں گے۔

محسن۔ اور کیا۔ ایک ایک آسمان کے برابر ہوتا ہے۔ زمین پر کھڑا ہو جائے تو اس کا سر آسمان سے جا لگے۔ مگر چاہے تو ایک لوٹے میں گھس جائے۔

سمیع۔ سُنا ہے چودھری صاحب کے قبضہ میں بہت سے جنات ہیں۔ کوئی چیز چوری جائے، چودھری صاحب اس کا پتہ دیں گے

اور چور کا نام تک بتا دیں گے۔ جمراتی کا بچھوا اس دن کھو گیا تھا۔ تین دن حیران ہوئے کہیں نہ ملا۔ تب جھک مار کر چودھری صاحب کے پاس گئے۔ چودھری نے کہا مویشی خانہ میں ہے اور وہیں ملا۔ جنات آ کر انھیں سب خبریں دے جایا کرتے ہیں۔

اب ہر ایک کی سمجھ میں آ گیا کہ چودھری قایم علی کے پاس کیوں اس قدر دولت ہے اور کیوں وہ قرب وجوار کے مواضعات کے مہاجن ہیں۔ جنات آ کر انھیں روپیہ دے جاتے ہیں۔ آگے چلئے یہ پولیس لائن ہے۔ یہاں پولیس والے قواعد کرتے ہیں۔ رائٹ لپ، پھام پھو!

نوری نے تصحیح کی۔ کیا کہا۔ یہ پولیس والے پہرہ دیتے ہیں۔

جب ہی تمھیں بہت خبر ہے۔ اجی حضرت یہ لوگ چوریاں کراتے ہیں شہر کے جتنے ڈاکو ہیں سب ان سے ملے رہتے ہیں۔ رات کو یہ سب ایک محلے میں تو چوروں سے کہتے ہیں چوری کرو۔ اور دوسرے محلے میں پکارتے ہیں جاگتے رہو، جاگتے رہو۔ میرے ماموں ایک تھانہ میں سپاہی ہیں۔ بیس روپیہ مہینہ پاتے ہیں۔ لیکن تھیلیاں بھر بھر کر گھر بھیجتے ہیں۔ اللہ قسم تھیلیاں بھر بھر۔ میں نے ایک بار پوچھا تھا ماموں اتنے روپئے کہاں سے لاتے ہیں۔ ہنس کر کہنے لگے بیٹا اللہ دیتا ہے۔ خود ہی بعد کو کہا کہ ہم لوگ چاہیں تو ایک دن میں لاکھوں مار لائیں۔ ہم تو اتنا ہی لیتے ہیں جس میں اپنی بدنامی

نہ ہوا اور نوکری بنی رہے۔

حامد نے تعجب سے پوچھا۔ یہ لوگ چوری کرواتے ہیں تو انھیں کوئی پکڑتا نہیں۔

نوری نے اس کی کوتاہ فہمی پر رحم کھا کر کہا۔ ارے احمق انھیں کون پکڑے گا۔ پکڑنے والے تو یہ خود ہیں۔ لیکن اللہ انھیں سزا بھی خوب دیتا ہے۔ تھوڑے دن ہوئے ماموں کے گھر میں آگ لگ گئی۔ سارا مال متاع جل گیا۔ ایک برتن نہ بچا۔ کئی دن درخت کے نیچے سوئے۔ اللہ قسم! پھر نہ جانے کہاں سے قرض لائے تو برتن بھانڈے آئے۔

بستی گھنی ہونے لگی۔ عید گاہ جانے والوں کے مجمع نظر آنے لگے ایک سے ایک زرق برق پوشاک پہنے ہوئے، کوئی تانگے پر سوار، کوئی موٹر پر، چلتے تھے تو کپڑوں سے عطر کی خوشبو اُڑتی تھی۔

دہقانوں کی یہ مختصر سی ٹولی اپنی بے سروسامانی سے بے حس، اپنی خستہ حالی میں مگن، صابر و شاکر چلی جا رہی تھی۔ جس چیز کی طرف تاکتے تکتے رہ جاتے اور پیچھے سے بار بار ہارن کی آواز ہونے پر بھی خبر نہ ہوتی محسن تو موٹر کے نیچے جاتے جاتے بچا۔

وہ عید گاہ نظر آئی۔ جماعت شروع ہو گئی ہے۔ اوپر املی کے درختوں کا سایہ ہے۔ نیچے کھلا ہوا پختہ فرش ہے۔ جس پر جاجم بچھا ہوا ہے اور نمازیوں کی قطاریں کھڑی ہیں۔ جو آتے جاتے ہیں،

پیچھے کھڑے ہوتے جاتے ہیں۔ آگے اب جگہ نہیں رہی۔ یہاں کوئی رتبہ اور عہدہ نہیں دیکھتا اسلام کی نگاہ میں سب برابر ہیں۔ دہقانیوں نے بھی وضو کیا اور جماعت میں شامل ہوگئے۔ کتنی باقاعدہ منظم جماعت ہے۔ لاکھوں آدمی ایک ساتھ جھکتے ہیں، ایک ساتھ دو زانو بیٹھ جاتے ہیں اور یہ عمل بار بار ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا بجلی کی لاکھوں بتیاں ایک ساتھ روشن ہو جائیں اور ایک ساتھ بجھ جائیں کتنا پر احترام رعب انگیز نظارہ ہے جس کی ہم آہنگی اور وسعت اور تعداد دلوں پر ایک وجدانی کیفیت پیدا کر دیتی ہے۔ گویا اخوت کا ایک رشتہ ان تمام روحوں کو منسلک کیے ہوئے ہے۔

(۲)

نماز ختم ہو گئی ہے۔ لوگ باہم گلے مل رہے ہیں۔ کچھ لوگ محتاجوں اور سائلوں کو خیرات کر رہے ہیں جو آج یہاں ہزاروں جمع ہوگئے ہیں۔ ہمارے دہقانیوں نے مٹھائی اور کھلونوں کی دوکان پر یورش کی۔ بوڑھے ان دل چسپیوں میں بچوں سے کم محظوظ نہیں ہیں۔ یہ دیکھو ہنڈولا ہے۔ ایک پیسہ دے کر کبھی آسمان پر جاتے معلوم ہوگے، کبھی زمین پر گرتے۔ یہ چرخی ہے۔ لکڑی کے گھوڑے، اونٹ، ہاتھی میخوں سے لٹکے ہوئے ہیں۔ ایک پیسہ دے کر بیٹھ جاؤ اور پچیس چکروں کا مزہ لو۔ محمود اور محسن ہنڈولے پر بیٹھے ہیں۔ نور اور سمیع گھوڑوں پر۔ اُن کے بزرگ اتنے ہی طفلانہ اشتیاق سے

چرخی پر بیٹھے ہیں۔ حامد دُور کھڑا ہے۔ تین ہی پیسے تو اُس کے پاس ہیں۔ ذرا سا چکر کھانے کے لیے وہ اپنے خزانہ کا ثلث نہیں صرف کر سکتا۔ محسن کا باپ اسے بار بار چرخی پر بُلاتا ہے۔ لیکن وہ راضی نہیں ہوتا۔ بوڑھے کہتے ہیں اس لڑکے میں ابھی سے اپنا پرایا آگیا۔ حامد سوچتا ہے کیوں کسی کا احسان لوں۔ عسرت نے اسے ضرورت سے زیادہ ذکی الحس بنا دیا ہے۔

سب لوگ چرخی سے اُترتے ہیں۔ کھلونوں کی خرید شروع ہوتی ہے۔ سپاہی اور گجریا اور راجہ رانی اور وکیل اور دھوبی اور بھشتی اور سپاہی بے امتیاز ان سے ران ملائے بیٹھے ہیں۔ دھوبی راجہ رانی کی بغل میں ہے اور بھشتی وکیل صاحب کی بغل میں۔ وہ کتنے خوبصورت بولا ہی چاہتے ہیں۔ محمود سپاہی پر لٹو ہو جاتا ہے خاکی وردی اور لال پگڑی کندھے پر معلوم ہوتا ہے ابھی قواعد کے لیے چلا آرہا ہے محسن کو بھشتی پسند آیا۔ کمر جھکی ہوئی ہے۔ اس پر مشک ہے۔ مشک کا دہانہ ایک ہاتھ سے پکڑے ہوئے ہے دوسرے ہاتھ میں رسّی ہے۔ کتنا بشاش چہرہ ہے شاید کوئی گیت گا رہا ہے۔ مشک سے پانی ٹپکتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ نوری کو وکیل سے مناسبت ہے کیسی عالمانہ صورت ہے۔ سیاہ چغہ۔ نیچے سفید اچکن، اچکن کے سینہ کی جیب میں گھڑی کی سنہری زنجیر، ایک ہاتھ میں قانون کی کوئی کتاب لیے ہوئے ہے۔ معلوم ہوتا ہے ابھی کسی عدالت سے جرح یا بحث کر کے چلے آرہے ہیں۔ یہ سب

دُو دُو پیسے کے کھلونے ہیں۔ حامد کے پاس کُل تین پیسے ہیں۔ اگر دو کا کھلونا لے لے تو پھر اور کیا لے گا۔ نہیں کھلونا فضول ہے۔ کہیں ہاتھ سے گر پڑے تو چور چور ہو جائے ذرا پانی پڑ جائے تو سارا رنگ دُھل جائے۔ ان کھلونوں کو لے کر وہ کیا کرے گا۔ کس مصرف کے ہیں۔

محسن کہتا ہے میرا بھشتی رُوز پانی دے جائے گا۔ صبح و شام۔

محمود۔ اور میرا سپاہی گھر کا پہرہ دے گا۔ کوئی چور آئے گا تو فوراً بندوق سے فیر کر دے گا۔

نوری۔ اور میرا وکیل رُوز مقدمہ لڑائے گا اور روز روپے لائے گا۔

حامد کھلونوں کی مذمت کرتا ہے۔ مٹّی کے تو ہیں۔ گریں تو چکنا چور ہو جائیں۔ لیکن ہر چیز کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا ہے اور چاہتا ہے کہ ذرا دیر کے لیے انھیں ہاتھ میں لے سکتا۔ یہ لباطی کی دوکان ہے۔ طرح طرح کی ضروری چیزیں ایک چادر پر بچھی ہوئی ہیں۔ گیند اور سیٹیاں اور بگل اور بھونرے اور ربڑ کے کھلونے اور ہزاروں چیزیں۔ محسن ایک سیٹی لیتا ہے۔ محمود گیند۔ نوری ربڑ کا بط جو چوں چوں کرتا ہے اور سمیع ایک خنجری اسے بجا بجا کر وہ گائے گا۔ حامد کھڑا ہر ایک چیز کو حسرت سے دیکھ رہا ہے۔ جب اُس کے رفیق کوئی چیز خرید لیتے ہیں تو وہ بڑے اشتیاق سے ایک بار

اُسے ہاتھ میں لے کر دیکھنے کے لیے لپکتا ہے، لیکن لڑکے اتنے دوست نواز نہیں ہوتے۔ خاص کر جب ابھی دلچسپی تازہ ہے۔ بیچارہ یوں ہی مایوس ہو کر رہ جاتا ہے۔

کھلونوں کے بعد مٹھائیوں کا نمبر آیا۔ کسی نے ریوڑیاں لی ہیں، کسی نے گلاب جامن، کسی نے سوہن حلوا۔ مزے سے کھا رہے ہیں۔ حامد ان کی برادری سے خارج ہے۔ کمبخت کی جیب میں تین پیسے تو ہیں۔ کیوں نہیں کچھ لے کر کھاتا۔ حریص نگاہوں سے سب کی طرف دیکھتا ہے۔

محسن نے کہا۔ حامد یہ ریوڑی لے جا کتنی خوشبودار ہیں۔

حامد سمجھ گیا۔ یہ محض شرارت ہے۔ محسن اتنا فیاض طبع نہ تھا پھر بھی وہ اس کے پاس گیا۔ محسن نے دونے سے دو تین ریوڑیاں نکالیں حامد کی طرف بڑھائیں، حامد نے ہاتھ پھیلایا، محسن نے ہاتھ کھینچ لیا اور ریوڑیاں اپنے منہ میں رکھ لیں۔ محمود اور نورا اور سمیع خوب تالیاں بجا بجا کر ہنسنے لگے۔ حامد کھسیانہ ہو گیا۔

محسن نے کہا۔ اچھا اب کے ضرور دیں گے۔ یہ لے جاؤ حامد۔ اللہ قسم

حامد نے کہا رکھیے رکھیے کیا میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔

سمیع ۔ تین ہی پیسے تو ہیں کیا کیا لو گے؟

محمود ۔ تم اس سے مت بولو حامد۔ میرے پاس آؤ۔ یہ

گلاب جامن لے لو۔

حامد۔ مٹھائی کون بڑی نعمت ہے۔ کتاب میں اس کی برائیاں لکھی ہیں۔

محسن۔ لیکن جی میں کہہ رہے ہوگے کہ کچھ مل جائے تو کھالیں اپنے پیسے کیوں نہیں نکالتے؟

محمود۔ میں اس کی ہوشیاری سمجھتا ہوں۔ جب ہمارے سارے پیسے خرچ ہو جائیں گے تب یہ مٹھائی لے گا اور ہمیں چڑھا چڑھا کر کھائے گا۔

حلوائیوں کی دوکانوں کے آگے کچھ دوکانیں لوہے کی چیزوں کی تھیں۔ کچھ گلٹ اور ملمع کے زیورات کی۔ لڑکوں کے لیے یہاں دلچسپی کا کوئی سامان نہ تھا۔ حامد لوہے کی دوکانوں پر ایک لمحہ کے لیے رُک گیا۔ دست پناہ رکھے ہوئے تھے۔ وہ دست پناہ خریدے گا اماں کے پاس دست پناہ نہیں ہے۔ توے سے روٹیاں اتارتی ہیں تو ہاتھ جل جاتا ہے۔ اگر وہ دست پناہ لے جاکر اماں کو دے دے گا تو وہ کتنی خوش ہوں گی۔ پھر ان کی انگلیاں کبھی نہ جلیں گی۔ گھر میں ایک کام کی چیز ہو جائے گی۔ کھلونوں سے کیا فائدہ۔ مفت کے پیسے خراب ہوتے ہیں۔ ذرا دیر ہی تو خوشی ہوتی ہے۔ پھر تو انھیں کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ یا تو گھر پہنچتے پہنچتے ٹوٹ پھوٹ برابر ہو جائیں گے یا چھوٹے بچے جو عیدگاہ نہیں جاسکتے ہیں ضد کر کے لے لیں گے۔ دست پناہ

کتنے فائدہ کی چیز ہے! روٹیاں توے سے اتار لو۔ چولھے پر سینک لو۔ کوئی آگ مانگنے آئے چولھے سے آگ نکال کر دے دو۔ اماں کو کہاں فرصت کہ بازار آئیں اور اتنے پیسے کہاں ملتے ہیں۔ روز ہاتھ جلا لیتی ہیں۔ اس کے ساتھی آگے بڑھ گئے ہیں۔ سبیل پر سب کے سب پانی پی رہے ہیں۔ کتنے لالچی ہیں سب نے اتنی مٹھائیاں لیں کسی نے مجھے ایک بھی نہ دی۔ اس پر کہتے ہیں میرے ساتھ کھیلو۔ میری تختی دھولاؤ۔ اب اگر میاں محسن نے کوئی کام کرنے کو کہا تو خبر لوں گا۔ کھائیں مٹھائیاں اب منہ سڑے گا۔ پھوڑے پھنسیاں نکلیں گی۔ آپ ہی چٹوری زبان ہو جائے گی۔ تب پیسے چرائیں گے اور مار کھائیں گے۔ میری زبان کیوں خراب ہوگی۔ اس نے پھر سوچا اماں دست پناہ دیکھتے ہی دوڑ کر میرے ہاتھ سے لے لیں گی! اور کہیں گی میرا بیٹا اپنی ماں کے لیے دست پناہ لایا ہے۔ ہزار دن دعائیں دیں گی۔ پھر اسے پڑوسنوں کو دکھائیں گی۔ سارے گاؤں میں واہ واہ مچ جائے گی۔ ان لڑکوں کے کھلونوں پر کون انہیں دعائیں دے گا۔

بزرگوں کی دعائیں سیدھی خدا کی درگاہ میں پہونچتی ہیں اور فوراً قبول ہوتی ہیں۔ میرے پاس بہت سے پیسے نہیں ہیں جب ہی تو محسن اور محمود یوں مزاج دکھاتے ہیں۔ میں بھی ان کو یوں مزاج دکھاؤں گا۔ وہ کھلونے کھیلیں اور مٹھائیاں کھائیں۔ میں غریب سہی

کسی سے کچھ مانگنے تو نہیں جاتا۔ آخر ابا جان کبھی نہ کبھی آئیں گے ہی پھر ان لوگوں سے پوچھوں گا کتنے کھلونے لوگے۔ ایک ایک کو ایک ایک ٹوکری دوں، اور دکھا دوں کہ دوستوں کے ساتھ اس طرح سلوک کیا جاتا ہے۔ جتنے غریب لڑکے ہیں سب کو اچھے اچھے کرتے دلوا دوں گا اور کتابیں دوں گا۔ یہ نہیں کہ ایک پیسہ کی ریوڑی لیں اور چڑھا چڑھا کر کھانے لگے۔ دستِ پناہ دیکھ کر سب کے سب خوب ہنسیں گے۔ احمق تو ہیں ہی سب۔ اس نے دوکان دار سے ڈرتے ڈرتے پوچھا یہ دست پناہ بیچو گے؟

دوکان دار نے اس کی طرف دیکھا اور ساتھ کوئی آدمی نہ دیکھ کر کہا "وہ تمہارے کام کا نہیں ہے۔

"بکاؤ ہے یا نہیں"؟

"بکاؤ ہے جی۔ اور یہاں کیوں لاد کر لائے ہیں۔"

"تو بتلاتے کیوں نہیں، کے پیسے کا دوگے"؟

"چھ پیسے لگیں گے!"

حامد کا دل بیٹھ گیا۔ کلیجہ مضبوط کر کے بولا "تین پیسے لوگے"؟ اور آگے بڑھا کہ دوکان دار کی گھڑکیاں نہ سنے۔ مگر دوکان دار نے گھڑکیاں نہ دیں۔ دست پناہ اس کی طرف بڑھا دیا اور پیسے لے لیے حامد نے دست پناہ کندھے پر رکھ لیا گویا بندوق ہے، اور شان سے اکڑتا ہوا اپنے رفیقوں کے پاس آیا۔

محسن نے ہنستے ہوئے کہا۔ یہ دست پناہ لایا ہے۔ احمق اس کا کیا کرے گا؟ حامد نے دست پناہ کو زمین پر پٹک کر کہا۔ "ذرا اپنا بھشتی زمین پر گرا دو ساری پسلیاں چور چور ہو جائیں گی بچّہ کی۔"

محمود۔ تو یہ دست پناہ کوئی کھلونا ہے۔

حامد۔ کھلونا کیوں نہیں ہے۔ ابھی کندھے پر رکھا بندوق ہو گیا۔ ہاتھ میں لے لیا فقیر کا چمٹا ہو گیا۔ چاہوں تو اس سے تمہاری ناک پکڑ لوں۔ ایک چمٹا جما دوں تو تم لوگوں کے سارے کھلونوں کی جان نکل جائے۔ تمہارے کھلونے کتنا ہی زور لگائیں اس کا بال بیکا نہیں کر سکتے۔ میرا بہادر شیر ہے یہ دست پناہ!

سمیع متاثر ہو کر بولا "میری خنجری سے بدلو گے؟ دو آنے کی ہے۔"

حامد نے خنجری کی طرف حقارت سے دیکھ کر کہا "میرا دست پناہ چاہے تو تمہاری خنجری کا پیٹ پھاڑ ڈالے بس ایک چمڑے کی جھلی لگا دی، ڈھب ڈھب بولنے لگی۔ ذرا سا پانی لگے تو ختم ہو جائے۔ میرا بہادر دست پناہ آگ میں، پانی میں، آندھی میں، طوفان میں برابر ڈٹا کھڑا رہے گا۔"

میلہ بہت دُور پیچھے چھوٹ چکا تھا۔ دس بج رہے تھے۔ گھر پہونچنے کی جلدی تھی اب دست پناہ نہیں مل سکتا۔ اب کسی کے پاس پیسے بھی تو نہیں رہے۔ حامد ہے بڑا ہوشیار!

اب دو فریق ہو گئے۔ محمود اور محسن اور نوری ایک طرف حامد

یکہ و تنہا دوسری طرف۔ سمیع غیر جانب دار ہے جس کی فتح دیکھے گا
اس کی طرف جا ملے گا۔ مناظرہ شروع ہو گیا ہے۔ آج حامد کی زبان
بڑی صفائی سے چل رہی ہے۔ اتحاد ثلاثہ اس کے جارحانہ عمل سے
پریشان ہو رہا ہے۔ ثلاثہ کے پاس تعداد کی طاقت ہے۔ حامد کے
پاس حق اور اخلاق، ایک طرف مٹی، ربڑ، لکڑی کی چیزیں ہیں۔
دوسری جانب اکیلا لوہا جو اس وقت اپنے کو فولاد کہہ رہا ہے، وہ
روئیں تن ہے۔ صف شکن ہے۔ اگر کہیں شیر کی آواز کان میں آ جائے
تو میاں بھشتی کے اوسان باختہ ہو جائیں۔ میاں سپاہی مٹی کی
بندوق چھوڑ کر بھاگیں، وکیل صاحب کا سارا قانون پیٹ میں
سما جائے۔ چغے میں منہ چھپا کر زمین پر لیٹ جائیں۔ مگر یہ بہادر، یہ
رستمِ ہند لپک کر شیر کی گردن پر سوار ہو جائے گا، اور اس کی
آنکھیں نکال لے گا۔

محسن نے ایڑی چوٹی کا زور لگا کر کہا "اچھا تمھارا دست پناہ
تو پانی نہیں بھر سکتا۔"

حامد نے دست پناہ کو سیدھا کر کے کہا۔ یہ بھشتی کو ڈانٹ
بتائے گا تو وہ دوڑتا ہوا پانی لا کر اس کے دروازے پر چھڑکنے لگے گا۔
جناب پھر اس سے چاہے گھڑے مٹکے کونڈے بھروا لو۔

محسن کا ناطقہ بند ہو گیا۔ نوری نے کمک پہونچائی۔ بچہ گرفتار
ہو جائیں تو عدالت میں بندھے بندھے پھریں گے۔ تب تو ہمارے

وکیل صاحب ہی پیروی کریں گے۔ بولیے جناب!

حامد کے پاس وار کا دفعیہ اتنا آسان نہ تھا۔ دفعتًا اس نے ذرا مہلت پا جانے کے ارادہ سے پوچھا اسے پکڑنے کون آئے گا۔ محمود نے کہا یہ سپاہی بندوق والا!

حامد نے منہ چڑھا کر کہا۔ یہ بیچارے اس رستمِ ہند کو پکڑیں گے؟ اچھا لاؤ۔ ابھی ذرا مقابلہ ہو جائے۔ اس کی صورت دیکھتے ہی بچّہ کی ماں مر جائے گی۔ پکڑیں گے کیا بیچارے۔

محسن نے تازہ دم ہو کر وار کیا اور کہا "تمہارے دستِ پناہ کا منہ روز آگ میں جلے گا۔" حامد کے پاس جواب تیار تھا۔ "آگ میں بہادر کودتے ہیں۔ جناب تمہارے یہ وکیل اور سپاہی اور بہشتی ڈرپوک ہیں۔ سب گھر میں گھس جائیں گے۔ آگ میں کودنا وہ کام ہے جو رستم ہی کر سکتا ہے۔

نوری نے انتہائی جودت سے کام لیا۔ "تمہارا دست پناہ باورچی خانہ میں زمین پر پڑا رہے گا۔ میرا وکیل شان سے کرسی لگا کر بیٹھے گا۔" اس حملہ نے مردوں میں بھی جان ڈال دی۔ سمیع بھی جیت گیا بے شک بڑے معرکے کی بات کہی۔ دست پناہ تو باورچی خانہ میں پڑا رہے گا۔

حامد نے دھاندلی کی۔ میرا دست پناہ باورچی خانہ میں نہیں رہے گا۔ وکیل صاحب کرسی پر بیٹھیں گے تو جا کر انھیں زمین پر پٹک

دے گا اور سارا قانون اُن کے پیٹ میں ڈال دے گا۔

اس جواب میں بالکل جان نہ تھی۔ بالکل بے تکی سی بات تھی لیکن قانون پیٹ میں ڈال دینے والی بات چھا گئی۔ ایسی چھا گئی کہ تینوں سورما منہ تکتے رہ گئے۔ حامد نے میدان جیت لیا۔ گو ثلاثہ کے پاس ابھی گیندا اور سیٹی اور بطہ رزور میں تھے مگر ان مشین گنوں کے سامنے اُن پٹاخوں کو کون پوچھتا۔ دست پناہ رستم ہند ہے اس میں کسی کو چون و چرا کی گنجایش نہیں۔

فاتح کو مفتوحوں سے وقار اور خوشامد کا خراج ملتا ہے۔ وہ حامد کو ملنے لگا۔ اوروں نے تین تین آنے خرچ کیے اور کوئی کام کی چیز نہ لے سکے۔ حامد نے تین ہی پیسوں میں رنگ جما لیا۔ کھلونوں کا کیا اعتبار دو ایک دن میں ٹوٹ پھوٹ جائیں گے۔ حامد کا دست پناہ تو فاتح رہے گا ہمیشہ۔ صلح کی شرطیں طے ہونے لگیں۔

محسن نے کہا "ذرا اپنا چمٹا دو۔ ہم بھی دیکھیں۔ تم چاہو تو ہمارا وکیل دیکھو" حامد کو اس میں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ وہ فیاض طبع فاتح ہے۔ دست پناہ باری باری سے محسن، محمود، نورا اور سمیع سب کے ہاتھوں میں گیا۔ اور ان کے کھلونے باری باری سے حامد کے ہاتھ میں آئے کتنے خوبصورت کھلونے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے بولا ہی چاہتے ہیں مگر ان کھلونوں کے لیے انھیں دعا کون دے گا؟ کون کون ان کھلونوں کو دیکھ کر اتنا خوش ہوگا جتنا اماں جان دست پناہ

کو دیکھ کر ہوں گی۔ اسے اپنے طرز عمل پر مطلق پچھتاوا نہیں ہے پھر اب تو دستِ پناہ رستم ہے۔ اور سب کھلونوں کا بادشاہ۔ راستے میں محمود نے ایک پیسے کی ککڑیاں لیں۔ اس میں حامد کو بھی خراج ملا حالانکہ وہ انکار کرتا رہا۔ محسن اور سمیع نے ایک ایک پیسے کے فالسے لیے حامد کو بھی خراج ملا۔ یہ سب رستم ہند کی برکت تھی۔

(۳)

گیارہ بجتے بجتے سارے گاؤں میں چہل پہل ہوگئی۔ میلے والے آگیے۔ محسن کی چھوٹی بہن نے دوڑ کر بھشتی اس کے ہاتھ سے چھین لیا اور مارے خوشی کے جو اُچھلی تو میاں بھشتی نیچے آرہے۔ اور عالم جاودانی کو سدھارے اس پر بھائی بہن میں مارپیٹ ہوئی دونوں خوب روئے، ان کی امّاں جان یہ کہرام سن کر اور بگڑیں دونوں کو اُوپر سے دو دو چانٹے رسید کیے۔ میاں نوری کے وکیل کا حشر اس سے بھی بدتر ہوا۔ وکیل زمین پر یا طاق پر تو نہیں بیٹھ سکتا اس کی پوزیشن کا تو لحاظ کرنا ہی ہوگا دیوار میں دو کھونٹیاں گاڑی گئیں۔ اُن پر چیڑ کا ایک پُرانا پٹرا رکھا گیا۔ پٹرے پر سُرخ رنگ کا ایک چیتھڑا بچھا دیا گیا جو کہ بہ منزلہ قالین تھا۔ وکیل صاحب عالم بالا پر جلوہ افروز ہوئے۔ یہیں سے قانونی بحث کریں گے۔ نوری ایک پنکھا لے کر جھلنے لگا۔ معلوم نہیں پنکھے کی ہوا سے یا پنکھے کی چوٹ سے وکیل صاحب عالم بالا سے دنیائے فانی میں آرہے اور

ان کے جسد خاکی کے پُرزے پُرزے ہو گئے۔ پھر بڑے زور شور کا ماتم ہوا اور وکیل صاحب کی میت پارسی دستور کے مطابق گھورے پہ پھینک دی گئی تاکہ بیکار نہ جاکر زاغ وزغن کے کام آجائے۔

اب رہے میاں محمود کے سپاہی۔ محترم اور ذی رُعب ہستی ہے چلنے کی ذلت اُسے گوارا نہیں۔ محمود نے اپنا بکری کا بچہ پکڑا اور اس پر سپاہی کو سوار کیا۔ محمود کی ایک ہاتھ سے سپاہی کو پکڑے ہوے تھی اور محمود بکری کے بچہ کا کان پکڑ کر اُسے دروازے پر چلا رہا تھا اور اس کے دونوں بھائی سپاہی کی طرف سے "سونے والے جاگتے رہو" پکارتے چلتے تھے۔ معلوم نہیں کیا ہوا میاں سپاہی اپنے گھوڑے کی پیٹھ سے گر پڑے اور اپنی بندوق لیے زمین پر آرہے۔ ایک ٹانگ مضروب ہوگئی مگر مضائقہ نہیں۔ محمود ہوشیار ڈاکٹر ہے۔ ڈاکٹر نگم اور بھاٹیا اس کی شاگردی کر سکتے ہیں۔ اور یہ ٹوٹی ٹانگ کو آناً فاناً میں جوڑ دے گا۔ صرف گولر کا دودھ چاہیے گولر کا دودھ آتا ہے ٹانگ جوڑی جاتی ہے لیکن سپاہی جوں ہی کھڑا ہوتا ہے ٹانگ پھر الگ ہو جاتی ہے۔ عمل جراحی ناکام ہو جاتا ہے۔ تب محمود اس کی دوسری ٹانگ بھی توڑ دیتا ہے اب وہ آرام سے ایک جگہ بیٹھ سکتا ہے۔ ایک ٹانگ سے تو چل نہ سکتا تھا نہ بیٹھ سکتا تھا اب وہ گوشہ میں بیٹھ کر ٹٹی کی آڑ میں شکار کھیلے گا۔

اب میاں حامد کا قصہ سنیے۔ امینہ اس کی آواز سنتے ہی دوڑی

اور اُسے گود میں اُٹھا کر پیار کرنے لگی۔ دفعتاً اس کے ہاتھ میں چمٹا دیکھ کر چونک پڑی۔

"یہ دست پناہ کہاں تھا بیٹا؟"

"میں نے مول لیا ہے۔ تین پیسے میں۔"

امینہ نے چھاتی پیٹ لی۔ "یہ کیسا بے سمجھ لڑکا ہے کہ دوپہر ہوگئی نہ کچھ کھایا نہ پیا۔ لایا کیا یہ دست پناہ، سارے میلے میں تجھے اور کوئی چیز ہی نہ ملی؟"

حامد نے خطا دارانہ انداز سے کہا۔ "تمھاری انگلیاں توے سے جل جاتی تھیں کہ نہیں؟"

امینہ کا غصہ فوراً شفقت سے تبدیل ہوگیا۔ اور شفقت بھی وہ نہیں جو پُر بیان ہوتی ہے۔ اور اپنی ساری تاثیر لفظوں میں منتشر کر دیتی ہے۔ یہ بے زبان شفقت کی درد اور التجا میں ڈوبی ہوئی، اُف! کتنی نفس کشی ہے۔ کتنی جاں سوزی ہے۔ غریب نے اپنے طفلانہ اشتیاق کو روکنے کے لیے کتنا ضبط کیا ہوگا۔ جب دوسرے لڑکے کھلونے لے رہے ہوں گے، مٹھائیاں کھا رہے ہوں گے اس کا دل کتنا لہراتا ہوگا۔ اتنا ضبط اس سے ہوا کیوں کر! اپنی بوڑھی اماں کی یاد اسے وہاں بھی رہی۔ میرا لال میری کتنی فکر رکھتا ہے۔ اس کے دل میں ایک ایسا علوی جذبہ پیدا ہوا کہ اس کے ہاتھ میں دنیا کی بادشاہت آجائے اور وہ اسے حامد کے اوپر نثار کر دے۔

اور تب ایک بڑی دل چسپ بات ہوئی۔ بڑھیا امینہ ننھی سی امینہ بن گئی۔ وہ رُونے لگی۔ دامن پھیلا کر حامد کو دعائیں دیتی جاتی تھی اور آنکھوں سے آنسو کی بڑی بڑی بوندیں گراتی جاتی تھی۔ حامد اس کا راز کیا سمجھتا۔ اور نہ شاید ہمارے بعض ناظرین ہی سمجھ سکیں گے۔

مولوی عبدالحق

ہاپڑ ضلع میرٹھ کے رہنے والے ہیں وہیں ۱۸۷۰ء میں پیدا ہوئے مسلم یونیورسٹی علی گڈھ سے بی۔ اے پاس کیا۔ عرصہ تک پنجاب اور حیدر آباد میں مختلف عہدوں پر فائز رہے ۱۹۲۰ء میں عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد دیں شعبۂ اُردو کے صدر مقرر ہوئے۔ آپ نے ابتدا ہی سے کل ہند انجمن ترقی اُردو کے علمی کاموں کی ذمہ داری اپنے سر لی تھی۔

آپ انجمن ترقی اُردو کے پہلے سکریٹری ہیں۔ تقسیم ہند سے پہلے بھی آپ اس انجمن کے سکریٹری تھے پاکستان بننے کے بعد آپ انجمن کی پاکستانی شاخ کے سکریٹری ہو کر پاکستان میں وہی کام کر رہے ہیں جو یہاں کرتے تھے۔

آپ کو قدیم دکنی ادبیات سے بہت دلچسپی رہی۔ آپ نے بہت سی قدیم کتابوں پر مفید مقدمات لکھ کر شائع کیے۔ آپ نے

ایک کتاب قواعد اردو کی بھی لکھی ہے۔ آپ عرصہ تک انجمن کے رسالہ "اردو" کے مدیر بھی تھے۔

آپ کی زبان مستند اور انداز بیان سادہ، پرزور و پختہ ہے تحریر میں شگفتگی ہے اور اختصار کے ساتھ ہر مطلب یوں واضح کردیتے ہیں کہ دوسرے طویل عبارت میں بھی نہ کرسکتے۔ روزمرہ اور محاورے کے استعمال سے عبارت کو پُرلطف بنادیتے ہیں، ہندی الفاظ کا استعمال نہایت برجستہ ہوتا ہے۔

ادب اردو اور چکبست

ایک زمانہ تھا کہ ہماری شاعری لطف صحبت اور تفنن کا کام دیتی تھی۔ وہ بھی ایک وقت تھا، دولت تھی، ثروت تھی، حکومت تھی، فارغ البالی تھی، دوسرے دنیاوی کاروبار کے ساتھ سامان عیش بھی تھا اور اسی سامان عیش کا ایک جزو شاعری بھی تھی۔ لیکن وقت ایک حال پر نہیں رہتا۔ زمانہ بہت کچھ بدل گیا ہے۔ ہمارے شاعر زمانے کی اس نیرنگی کو معشوقوں کے تلوّن سے تشبیہ دیتے ہیں۔ لیکن بیچارے معشوق خود اس زمانے کے ہاتھوں مجبور ہیں۔ اب زمانہ کچھ اور ہوگیا ہے اب نئے دور نے جنم لیا ہے۔ نئے حالات کے ساتھ نئے خیالات اُمڈے چلے آرہے ہیں اور اُس کے ساتھ ساتھ نئی نئی مصیبتیں

اور آفتیں بھی ہمارے سر پر تلی کھڑی ہیں۔ ان مصیبتوں کے ٹالنے اور ان آفتوں کا مقابلہ کرنے کے لیے ہمیں طرح طرح کی قربانیاں اور طرح طرح کی جدوجہد کی ضرورت ہے کیا اس جدوجہد کے لیے نئے آلات اور نئی حکومتوں کی ضرورت ہے کیا اس جدوجہد میں شاعر کا کوئی حصہ نہیں؟ کیا شاعر ہماری سوسائٹی اور ہماری قوم کا جزو نہیں کیا وہ کوئی عجیب الخلقت مخلوق ہے؟ کیا وہ ہمارے آرام و آسائش اور ہمارے دکھ درد اور ہماری مسرتوں اور آلام میں شریک نہیں؟ کیا اس کا کام صرف مسخرگی اور دل لگی ہے؟ کیا اس کا دل ایسا پتھر اور اس کی جلد ایسی موٹی ہے کہ اس پر کسی چوٹ کا اثر نہیں ہوتا؟ اگر یہ ہے تو وہ شاعر نہیں مسخرہ ہے۔

فن شعر کے لحاظ سے شاعر کی دو حیثیتیں ہیں۔ ایک نجی حیثیت ہے یعنی یہ کہ وہ شعر کس طرح کہتا ہے۔ مثلاً چت لیٹ کے یا پٹ لیٹ کے کھڑے کھڑے، یا لیٹے لیٹے، ٹہل ٹہل کر یا باقاعدہ میز کرسی پر بیٹھ کر اس سے ہمیں کچھ بحث نہیں۔ دوسری حیثیت اس کی وہ تعلق ہے جو اسے جمہور سے ہے اور یہی اس کی شاعری کی کسوٹی ہے یہ تعلق کیا ہے؟ اسے میں ایک جملہ میں عرض کیے دیتا ہوں۔ شاعر خلق اللہ کے لیے وہ کچھ کر سکتا ہے جو وہ خود اپنے لیے نہیں کر سکتا۔ شاعری میں ایک عنصر ایسا بھی ہوتا ہے جو اسے ایک دوسرے عالم میں لے جاتا ہے اور اسے اصلی اور حقیقی دنیا سے کچھ واسطہ نہیں رہتا اور اس عالم خیال میں

اسے خاص لطف اور حظ حاصل ہوتا ہے۔ اکثر نقاد شاعری کا مقصد صرف یہی سمجھتے ہیں اگر شاعر اس عالم خیال میں پہونچ کر وہیں کا ہو جائے تو بہک جاتا ہے۔ لیکن اصلی شاعر اس عالم میں پہنچ کر اپنے اصلی اندیشوں اصلی خواہشوں اور اصلی امیدوں اور دل کی تہ میں چھپے ہوئے رازوں کو اس طرح پیش کرتا ہے کہ وہ تڑپ اٹھتا ہے اور یہ تڑپ اسے حقیقی اور زندہ دنیا کی طرف کھینچ لاتی ہے اور اسے اس بدلتی ہوئی دنیا کے مقابلے کے لیے زیادہ اہل بنا دیتی ہے۔ ہم ایک دوسرے معاملہ میں ضرور دلچسپی لیتے ہیں لیکن یہ دلچسپی ایک قسم کا تفنن ہوتا ہے۔ جیسے اخباروں میں کرکٹ اور فٹ بال کے میچوں کے ذکر یا آپس کے تنازع اور جھگڑے سے، یہ دلچسپیاں عارضی ہیں۔ ان سے ہمدردی نہیں ہوتی جب تک کوئی ایسی قوت نہ ہو جو لوگوں کو ناانصافی، رسم و رواج کے تشدد اور گمراہیوں کے خلاف آمادہ کرائے۔ کبھی کوئی سچی ہمدردی اور حقیقی اتحاد پیدا نہیں ہو سکتا۔ سیاسی لیڈر کبھی یہ بات پیدا نہیں کر سکتے۔ اس لیے کہ وہ لوگوں کے تخیل کو ابھار نہیں سکتے۔ یہ شاعر ہی ہے جو ان کے تخیل کو گدگداتا اور دبی ہوئی آگ کو بھڑکاتا ہے اور انھیں ایک رشتہ میں منسلک کر دیتا ہے وہ اپنے زور بیان تشبیہوں اور استعاروں، مبالغا ور تخیل کے ذریعے منتشر قوتوں کو ایک جا جمع کر دیتا ہے، افراد کو جماعت میں منتقل کر دیتا اور کثرت کو وحدت میں بدل دیتا ہے۔ ساری قوم ایک فرد واحد ہو جاتی ہے۔ اُس وقت آن میں جذبہ عمل پیدا

ہوجاتا ہے اور وہ زندگی کے اس مقصد کی طرف کھنچے چلے جاتے ہیں جس کی رہنمائی ایک سچا شاعر ہی کر سکتا ہے۔

ملک میں افلاس ہے، جہالت ہے، غلاظت ہے، گمراہی ہے اور نہ معلوم کیا کیا خرابیاں ہیں۔ کیا یہ اس لیے ہیں کہ لوگ جہالت و افلاس کو اچھا سمجھتے ہیں۔ شاید ہی کوئی ایسا ہے جو ان لعنتوں کو اچھا سمجھتا ہو۔ تو پھر ان کا وجود کیوں ہے؟ یہ ہیں اور رہیں گی اس لیے کہ جو لوگ ان لعنتوں میں مبتلا نہیں وہ اس سے کامل ہمدردی نہیں رکھتے جو ان میں مبتلا ہیں کامل ہمدردی اس وقت پیدا ہوسکتی ہے جبکہ مصیبت زدہ کے رنج و تکلیف کا حقیقی احساس ہو۔ یعنی وہ شخص اپنے اوپر وہی حالت طاری کرے جو مصیبت زدہ پر اور یہ کیفیت صرف تخیل ہی کی قوت سے پیدا ہوسکتی ہے۔ یہی وجہ ہے سیاسی لیڈر کامیاب نہیں ہوتا۔ اور سچا شاعر کامیاب ہوجاتا ہے جس قدر جس کا تخیل قوی اور تیز ہوگا۔ اسی قدر وہ اپنے اوپر دوسروں کی حالت طاری کرے گا۔ اور اسی قدر اس کی ہمدردی زیادہ قوی اور کامل ہوگی۔ شاعر کا سب سے بڑا کام یہ ہے کہ وہ تخیل کو گدگداتا اور ابھارتا ہے اور اس میں خیال، جذبہ، عمل سب کچھ آجاتا ہے۔

حضرات! یہ کام ہماری اردو کے تین شاعروں نے انجام دیا حالی چکبست اور اقبال، ان کے کلام میں خلوص، درد اور جوش پایا جاتا ہے، ان تینوں نے ملک اور قوم کی وہ ضروری اور اعلیٰ خدمت انجام

دی ہے جو کسی دوسری طرح ممکن نہ تھی۔ یورپی نقاد کہتے ہیں کہ شاعری کا ماحصل لطف وحظ ہے وہ یہ کہہ سکتے ہیں کیونکہ انھیں فارغ البالی حاصل ہے۔ سامان عیش وآرام مہیا ہے، تمدن کی بہت سی اعلیٰ منزلیں طے کر چکے ہیں۔ لیکن ہم یہ کس منہ سے کہہ سکتے ہیں۔ ہمیں صرف لطف حاصل کرنا ہی مقصود نہیں بلکہ ہمیں سکون وجمود کو بھی توڑنا ہے غفلت وکاہلی کو مٹانا ہے، دلوں میں احساس وحرکت پیدا کرنی ہے اور سچ پوچھیے تو مردوں کو زندہ کرنا ہے۔ ہمیں ایسے ہی شاعروں کی ضرورت تھی جیسے حالی چکبست اور اقبال ہیں اور ان کا بڑا احسان ہے کہ انھوں نے اپنے نغموں اور نالوں سے قوم کو جگانے کا کام لیا اور یہی وجہ ہے کہ ہم دل سے ان کا احترام اور عزت کرتے ہیں۔

یوں تو میں نے چکبست کا کلام پڑھا تھا لیکن تین سال کا عرصہ ہوتا ہے میرے ایک طالب علم نے جس کا مضمون اُردو تھا اپنے مقالے (تھیسس) کے لیے چکبست کو انتخاب کیا۔ اُسے یہ کام میری نگرانی اور ہدایت میں کرنا تھا۔ طالب علم محنتی اور شوقین تھا۔ اور محنتی اور اور شوقین طالب علم اُستاد کے لیے وبال جان ہو جاتا ہے۔ اس کے ساتھ مجھے بھی چکبست کا کلام غور سے پڑھنا پڑا۔ اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ وہ کیسا قادر الکلام شاعر ہے زور بیان اور فصاحت زبان کے ساتھ خلوص اور درد بھی ہے، وہ ملک کی بے بسی اور خستہ حالی کو دیکھ کر بیچین ہو جاتا ہے اور حال میں جو کچھ کہتا ہے اس

کا ہر کلمہ اثر سے بھرا ہوا ہوتا ہے وہ آزادی کا دلدادہ ہے مگر بے لگامی
کا روادار نہیں۔ وہ سچا لبرل ہے اور اس رستے پر چلنے والا
ہے جو بال سے باریک اور تلوار کی دھار سے تیز ہے جس کا دوسرا نام
اعتدال ہے لوگ اعتدال پر ہنستے ہیں اس لیے کہ وہ اس پر چل نہیں
سکتے۔ انگریزی یونیورسٹی کا تعلیم یافتہ ہے۔ مگر یورپ کا اندھا مقلد
نہیں۔ وہ اپنے ملک کی معاشرت اور رسم و رواج سے خوب واقف
ہے اور اُن کے عیب چن چن کے دکھاتا ہے لیکن وہ یہ ہرگز پسند نہیں
کرتا کہ نئے خیالات کی رو میں ہماری خوبیاں بھی بہہ جائیں وہ جذبات
انسانی سے گہری واقفیت رکھتا تھا اور بعض اوقات نازک جذبات
کو موقع پر بڑی خوبی اور حسن سے ادا کر جاتا ہے۔ اس کا مشاہدہ بھی
معمولی نہیں وہ حقیقت اور واقعیت کو خوبصورت تشبیہوں اور
استعاروں میں اس طرح بیان کرتا ہے کہ تصویر کھنچ جاتی ہے اور یہ
سب باتیں اس زبان میں فصاحت کے ساتھ بیان کرتا ہے جو ہماری
ایک جہتی کی سب سے بڑی اور قابل قدر یادگار ہے اور آیندہ
بھی آپس کے اتحاد میں کارگر ثابت ہوگی۔ اس نے اپنے کلام سے
اُردو زبان کا مرتبہ بڑھا دیا ہے اور اس کے ساتھ ہی اُردو ادب
میں اپنی جگہ قایم کر دی۔ بلاشبہ اس کا شمار ہمارے اساتذہ میں
ہے۔

———— ❋ ————

خواجہ حسن نظامی

خواجہ حسن نظامی ۱۸۷۹ء میں دلّی میں پیدا ہوئے۔ آپ کا تعلق خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے خاندان سے ہے۔

آپ ایک صوفی منش بزرگ کے خاندان سے تعلق بھی رکھتے ہیں اور خود بھی ایک صوفی منش بزرگ ہیں۔

خواجہ صاحب کو مضمون نویسی کا شوق ابتدا ہی سے تھا۔ اخبارات و رسائل میں مضامین لکھا کرتے تھے۔ شروع نثر نویسی میں آپ نے آزاد کی تقلید کی لیکن رفتہ رفتہ اپنا ایک خاص طرز و اسلوب بیان پیدا کر لیا جو بہت پسندیدہ و مقبول ہوا۔ عہد حاضر کے اہل قلم میں ممتاز حیثیت کے مالک ہیں۔

ہندوستان کے ہر گوشے میں آپ کی زبان اور طرز بیان کی دھوم دھام ہے۔ آپ کی زبان دہلی کی مستند ٹکسالی زبان ہے۔ سادگی برجستگی، روانی شیرینی، صفائی، عام فہمی آپ کی خصوصیات ہیں۔ آپ کی عبارت میں بلا کی رنگینی پائی جاتی ہے۔ معمولی خیالات کو نہایت دلکش اور موثر انداز میں تحریر کرتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے شگفتہ جملوں میں اپنا مطلب ادا کر دیتے ہیں۔ خواجہ صاحب اب تک سو سے اوپر کتابیں لکھ چکے ہیں۔ غدر دہلی کے حالات میں کئی کتابیں لکھی ہیں۔ درد انگیز

واقعات کو ایسے مؤثر انداز میں بیان کرتے ہیں کہ سخت سے سخت دل
بھی نرم ہو جاتا ہے آپ کو **مصوّرِ فطرت** کا لقب دیا گیا ہے
عربی و فارسی کے مناسب الفاظ کے ساتھ ہندی کے اچھے اور بے تکان
ادا ہونے والے الفاظ بھی بڑی بے ساختگی سے استعمال کرتے ہیں۔
آپ کے مضامین میں روحانیت ہر جگہ جلوہ نما ہے۔ آپ نے "لالٹین"
"برف" "دیا سلائی" "جھینگر" ایسے معمولی اور حقیر چیزوں پر
جو مضامین لکھے ہیں ان میں بھی اخلاقی۔ روحانی اور صوفیانہ نکات
حل کیے ہیں بیان کا ہر ہر لفظ عام پڑھنے والوں کے لیے درس معرفت
بن جاتا ہے۔

"شہزادے کا بازار میں گھسٹنا"

یہ دہلی جس کو ہندوستان کا دل اور حکومت کا تخت گاہ کہتے
ہیں جب آباد تھی اور لال قلعہ میں مغلوں کی آخری شمع ٹمٹما رہی تھی
آفت اور بلا میں مبتلا ہونے کو ہوئی تو پہلے اس کے باشندوں کے عمل
میں فرق آیا۔ "اَلنَّاسُ عَلٰی دِیْنِ مُلُوْکِهِمْ" پہلے حاکموں کے
اعمال خراب ہوئے اس کی رعیت بھی بداعمالیوں میں پڑ گئی نتیجہ یہ
ہوا کہ راجہ پرجا دونوں برباد ہو گئے۔ مثالیں ہزاروں ہیں مگر ذیل
میں ایک نہایت عبرتناک کہانی سناکر میں باشندگانِ ہند کو عموماً اور

مسلمان صوفیوں کو خصوصاً خدا کے خوف سے ڈراتا ہوں۔

(۱)

غدر سے ایک برس پہلے دہلی سے باہر جنگل میں چند شہزادے شکار کھیلتے پھرتے تھے۔ اور بے پروائی سے چھوٹی چھوٹی چڑیوں فاختاؤں کو جو دوپہر کی دھوپ سے بچنے کے لیے درختوں کی ہری بھری ٹہنیوں پر خدا کی یاد کی تسبیح پڑھ رہی تھیں غلے مار رہے تھے۔ سامنے سے ایک گدڑی پوش فقیر آنکلا۔ اور اس نے نہایت ادب سے شہزادوں کو سلام کرکے عرض کیا کہ میاں صاحبزادوں! ان بے زبان جانوروں کو کیوں ستاتے ہو انھوں نے تمھارا کیا بگاڑا ہے۔ ان کے بھی جان ہے۔ یہ بھی تمھاری طرح دکھ اور تکلیف کی خبر رکھتے ہیں۔ مگر بے بس ہیں اور مُنہ سے کچھ نہیں کہہ سکتے۔ تم بادشاہ کی اولاد ہو۔ بادشاہوں کو اپنے ملک میں رہنے والوں پر محبت اور مہربانی کرنی چاہیے۔ یہ جانور بھی ملک میں رہتے ہیں۔ ان کے ساتھ بھی رحم اور انصاف برتا جائے تو شانِ بادشاہی سے دُور نہیں۔"

بڑے شہزادے نے جس کی عمر اٹھارہ برس کی تھی شرما کر غلیل ہاتھ سے رکھ دی۔ چھوٹے مرزا نصیر الملک بگڑ کر بولے۔ جا رے جا۔ ڈو نکے کا آدمی ہم کو نصیحت کرنے نکلا ہے۔ تو کون ہوتا ہے ہم کو سمجھانے والا۔ سیر شکار سب کرتے ہیں۔ ہم نے کیا تو کون سا گناہ ہو گیا۔ فقیر بولا، صاحب عالم ناراض نہ ہوں۔ شکار ایسے جانوروں کا کرنا چاہیے۔

ایک جان جائے تو دس پانچ جانوروں کا پیٹ تو بھرے۔ ان ننھی ننھی چڑیوں کے مارنے سے کیا نتیجہ۔ بیس مارو گے تب بھی ایک آدمی شکم سیر نہ ہوگا" نصیر مرزا فقیر کے دوبارہ بولنے سے آگ بگولہ ہو گئے اور ایک غلّہ غلیل میں رکھ کر فقیر کے گھٹنے میں اس زور سے مارا کہ بیچارہ منہ کے بل گر پڑا اور بے اختیار اس کی زبان سے نکلا "ہائے ٹانگ توڑ ڈالی" فقیر کے گرتے ہی شہزادے گھوڑوں پر سوار ہو کر قلعے کی طرف چلے گئے۔ اور فقیر گھسٹتا ہوا سامنے کے قبرستان کی طرف چلنے لگا۔ گھسٹتا جاتا تھا اور کہتا جاتا تھا" وہ تخت کیونکر آباد رہے گا جس کے وارث ایسے سفاک ظالم ہیں۔ لڑکے تو نے میری ٹانگ توڑ دی خدا تیری بھی ٹانگ توڑے اور تجھ کو بھی گھسٹنا نصیب ہو۔"

(۲)

توپیں گرج رہی تھیں گولے برس رہے تھے۔ زمین پر چاروں طرف لاشوں کے ڈھیر نظر آتے تھے۔ شہر دہلی ویران اور سنسان ہوتا جاتا تھا۔ کہ لال قلعہ سے پھر وہی چند شہزادے گھوڑوں پر سوار بدحواسی کے عالم میں بھاگتے ہوئے نظر آئے اور پہاڑ گنج کی طرف جانے لگے۔ دوسری طرف بیس پچیس گورے سپاہی دھاوا کرتے چلے آتے تھے۔ انھوں نے ان نوعمر سواروں پر یک سخت بندوقوں کی باڑ ماری۔ گولیوں نے گھوڑوں اور سواروں کو چھلنی کر دیا۔ یہ سب شہزادے فرشِ خاک پر گر کر خوں میں تڑپنے لگے گورے جب قریب آئے تو دیکھا نو شہزادے

جان بحق ہو چکے ہیں۔ مگر ایک سانس لے رہا ہے۔ ایک سپاہی نے زندہ شہزادے کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا تو معلوم ہوا اس کے کہیں زخم نہیں آیا۔ گھوڑے کے گرنے سے معمولی کھرنچیں آئی ہیں اور دہشت کے مارے غشی طاری ہو گئی ہے۔ صحیح سالم دیکھ کر گھوڑے کی باگ ڈور سے شہزادے کے ہاتھ باندھ دیے۔ اور حراست میں کر کے دو سپاہیوں کے ہاتھ کیمپ میں بھجوا دیا۔ کیمپ پہاڑی پر تھا۔ جہاں گوروں کے علاوہ کالوں کی فوج بھی تھی۔ جب بڑے صاحب کو معلوم ہوا کہ یہ بادشاہ کا پوتا نصیر الملک ہے تو وہ بہت خوش ہوئے اور حکم ہوا کہ اس کو حفاظت سے رکھا جائے۔

باغیوں کی فوجیں شکست کھا کر بھاگنے لگیں اور انگریزی لشکر یلغار کرتا ہوا شہر میں گھس گیا۔ بہادر شاہ ہمایوں کے مقبرے میں گرفتار ہو گئے۔ تیموری بزم کا چراغ جھلملا کر گل ہو گیا۔ اور جنگل شریف زادیوں کے برہنہ سروں اور کھلے چہروں سے آباد ہونے لگا۔ باپ بچوں کے سامنے ذبح ہونے لگے۔ اور مائیں اپنے جوان بیٹوں کو خاک و خون میں لوٹتا دیکھ کر چیخیں مارنے لگیں۔

اسی دار و گیر میں پہاڑی کیمپ پر مرزا نصیر الملک رسی سے بندھے بیٹھے تھے کہ ایک ہندوستان سپاہی دوڑتا ہوا آیا اور کہا جلدی میں نے آپ کی رہائی کے لئے صاحب سے اجازت حاصل کر لی ہے۔ جلدی بھاگ جاؤ ایسا نہ ہو کسی دوسری بلا میں پھنس جاؤ۔

مرزا بیچارے پیدل چلنا کیا جانیں حیران تھے کہ کیا کریں۔ لیکن مرتا کیا نہ کرتا پٹھان کا شکریہ ادا کر کے نکلے اور جنگل کی طرف ہو لیے۔ چل رہے تھے مگر یہ خبر نہ تھی کہ کہاں جاتے ہیں۔ ایک میل چلے ہوں گے کہ پیروں میں چھالے پڑ گئے۔ زبان خشک ہو گئی۔ حلق میں کانٹے پڑنے لگے۔ تھک کر ایک درخت کے سایہ میں گر پڑے اور آنکھوں میں آنسو بھر کر آسمان کی طرف دیکھا کہ الٰہی یہ کیا غضب ہم پر ٹوٹا۔ ہم کہاں جائیں کدھر ہمارا ٹھکانا ہے۔ اوپر نگاہ اٹھائی تو درخت پر نظر پڑ گئی دیکھا فاختہ کا ایک گھونسلا بنا ہوا ہے۔ اور وہ آرام سے اپنے انڈوں پر بیٹھی ہے۔ اس کی آزادی اور آسائش پر شہزادے کو بڑا رشک آیا اور کہنے لگے کہ فاختہ! مجھ سے تو تو لاکھ درجے بہتر ہے کہ آرام سے اپنے گھونسلے میں بے فکر بیٹھی ہے۔ میرے لیے تو آج زمین، آسمان میں کہیں جگہ نہیں۔

تھوڑی دور ایک بستی نظر آئی تھی ہمت کر کے وہاں جانے کا ارادہ کیا۔ اگرچہ پاؤں کے چھالے چلنے نہ دیتے تھے۔ مگر اُفتاں و خیزاں گرتے پڑتے وہاں پہونچے تو عجیب منظر نظر آیا۔

ایک درخت کے نیچے سیکڑوں گنوار جمع تھے اور چبوترے پر ایک تیرہ ۱۳ سال کی معصوم لڑکی بیٹھی تھی جس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ کان لہو لہان ہو رہے تھے۔ اور دیہاتی اس کا مذاق اڑا رہے تھے جونہی مرزا کی نگاہ اس بچی پر پڑی اور اس بیچاری نے مرزا

کو دیکھا دونوں کی چیخیں نکل پڑیں۔

بھائی بہن کو اور بہن بھائی کو چمٹ کر رونے لگے۔ مرزا نصیر الملک کی یہ چھوٹی بہن اپنی والدہ کے ساتھ رتھ پر سوار ہو کر قلعے سے قطب صاحب کو چلی گئی تھی مرزا کو گمان یہی تھا کہ وہ اس آفت میں مبتلا ہو گی۔ پوچھا تم یہاں کہاں؟

رُو کر بولی!

اگّا جی گوجروں نے ہم کو لوٹ لیا۔ نوکروں کو مار ڈالا۔ اماں جان کو دوسرے گاؤں والے لے گئے اور مجھ کو یہاں لے آئے میری بالیاں انھوں نے نوچ لیں۔ میرے طمانچے بھی طمانچے مارے ہیں۔

اتنا کہہ کر لڑکی کی ہچکی بندھ گئی۔ اور کوئی لفظ اس کی زبان سے نہ نکلا۔

بیکس شہزادے نے اپنی غریب بہن کو دلاسا دیا اور ان گنواروں سے عاجزی کرنے لگا کہ اس کو چھوڑ دو۔ گوجر بگڑ کر بولے ارے جا آیا بیچارہ۔ ایک گنڈاسا ایسا ماریں گے کہ گردن کٹ جائے گی۔ اس کو ہم دوسرے گاؤں سے لائے ہیں۔ لا دام دے جا، اور لے جا۔

مرزا نے کہا۔ چودھری دام کہاں سے دوں۔ میں تو خود تم سے روٹی کا ٹکڑا مانگنے کے قابل ہوں، دیکھو ذرا تم رحم کرو کل تم ہماری

رعیت تھے۔ اور ہم بادشاہ کہلاتے تھے۔ آج آنکھیں نہ پھیرو۔ خدا
کسی کا وقت نہ بگاڑے۔ اگر ہمارے دن پھر گئے تو مالامال کر دیں گے
یہ سُن کر گنوار بہت ہنسے اور کہنے لگے اوہو! آپ بادشاہ سلامت
ہیں! تب تو ہم تم کو فرنگیوں کے ہاتھ بیچیں گے۔ اور یہ چھوکری تو
اب ہمارے گاؤں کی ٹہل کرے گی۔ جھاڑو دے گی۔ ڈھوروں کے
آگے چارہ ڈالے گی۔ گوبر اٹھائے گی۔

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ سامنے سے انگریزی فوج آ گئی اور
گاؤں والوں کو گھیر لیا۔ اور چاروں چو[illegible]یوں کو اور ان دونوں
شہزادے شہزادی کو پکڑ کر لے گئے۔

چاندنی چوک کے بازار میں پھانسیاں گڑی ہوئی تھیں اور جس
کو انگریزی افسر کہہ دیتے کہ یہ قابل دار ہے اسی کو پھانسی مل جاتی تھی۔
ہر روز سیکڑوں آدمی دار پر لٹکائے جاتے، گولیوں سے اُڑائے جاتے
اور تلواروں سے ذبح ہوتے تھے۔ ہر طرف اُس خونریزی سے تہلکہ تھا۔
مرزا نصیر الملک اور ان کی بہن بھی بڑے صاحب کے سامنے پیش
ہوئے۔ اور صاحب نے ان دونوں کو خورد سال سمجھ کر بے قصور سمجھا
اور چھوڑ دیا۔ دونوں نجات پا کر ایک سوداگر کے ہاں نوکر ہو گئے۔
لڑکی سوداگر کے بچے کو کھلاتی تھی اور نصیر الملک بازار کا سودا سلف
لایا کرتے تھے۔ چند روز کے بعد لڑکی [illegible] میں مبتلا ہو کر مر گئی اور
مرزا کچھ دن ادھر ادھر نوکریاں [illegible] رہے آخرکار مسکا[illegible]

نے اُن کی پانچ روپیہ ماہوار پنشن مقرر کر دی۔

ایک برس کا ذکر ہے دہلی کے بازار چتلی قبر۔ کمرہ بنگش وغیرہ میں ایک پیر مرد جن کا چہرہ چنگیزی نسل کا پتہ دیتا تھا۔ کوٹھوں کے بل گھستے پھرا کرتے تھے ان کے پاؤں شاید فالج سے بے کار ہو گئے تھے اس لیے ہاتھوں کو ٹیک کر کوٹھوں کو گھسیٹتے ہوئے راستہ چلتے تھے ان کے گلے میں ایک جھولی ہوتی تھی۔ دو قدم چلتے اور راہ گیروں کو حسرت سے دیکھتے گویا آنکھوں ہی آنکھوں میں اپنی محتاجی ظاہر کر کے بھیک مانگتے تھے جن لوگوں کو ان کا حال معلوم تھا ترس کھا کر جھولی میں کچھ ڈال دیتے تھے۔ دریافت سے معلوم ہوا کہ ان کا نام مرزا نصیر الملک اور یہ بہادر شاہ کے پوتے ہیں۔ سرکاری پنشن قرضہ میں برباد کر دی۔ اور اب خاموش گداگری پر گزارہ ہے۔ مجھ کو ان کے حال سے عبرت ہوتی تھی۔ اور جب ان کا ابتدائی قصہ جو کچھ خود ان کی زبانی اور کچھ دوسرے شہزادوں کی زبانی سُنا تھا یاد آتا تو دل دہل جاتا تھا کہ اس فقیر کا کہنا پورا ہوا جس کی ٹانگ میں انھوں نے غلّہ مارا تھا۔ شہزادے صاحب کا بازار میں گھسٹتا پھرنا سخت سے سخت دل کو موم کر دیتا تھا اور خدا کے خوف سے دل کانپ جاتا تھا۔ اب ان شہزادے صاحب کا انتقال ہو گیا۔

نیاز فتح پوری

مولانا نیاز محمد خاں نیاز ۱۸۸۴ء میں اپنے وطن فتح پور میں پیدا ہوئے عربی فارسی گھر پر پڑھ کر مدرسہ اسلامیہ فتح پور، مدرسہ عالیہ رام پور اور ندوۃ العلماء لکھنؤ میں تکمیل کی۔ انگریزی و ترکی پرائیویٹ پڑھی۔ مختلف روزنامہ اخبارات میں کام کیا اور اب ایک عرصہ سے رسالہ "نگار" کے ایڈیٹر و مالک ہیں۔ یہ ایک بلند پایہ علمی و ادبی رسالہ ہے۔

آپ ایک اچھے ادیب بھی ہیں اور جرنلسٹ بھی۔ آپ کا قلم ادبی مذہبی سیاسی اور اقتصادی غرض ہر مضمون پر یکساں زور دکھاتا ہے۔

آپ کا طرز تحریر بہت منفرد ہے۔ پہلے یہ تصنع کی حد تک رنگینی میں پہونچ گیا تھا اور فارسیت و عربیت کا بہت گہرا رنگ چڑھا ہوا تھا مگر اب آپ کی تحریر میں بہت اعتدال پیدا ہو گیا ہے آپ کا انداز بیان انگریزی طرز انشا سے بہت متاثر ہے جس سے آپ کے مخصوص رنگ میں ایک اور حسن پیدا ہو گیا ہے۔ اور اب آپ کا اسلوب اردو کے اسالیب میں ایک قابل قدر اضافہ سمجھا جاتا ہے۔

دیو جانس کلبی

دیو جانس کلبی یونان کا مشہور فلسفی حضرت مسیح سے چار سو تیرہ سال قبل صوبہ بنطس کے شہر سینوب میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ اسکیوس صرافی کیا کرتا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی کھوٹے روپے بھی چلاتا تھا۔ اسلئے گرفتار کر لیا گیا اور قید ہونے کے بعد حالت قید میں ہی اس کا انتقال ہو گیا۔ باپ کے مرنے کے بعد دیو جانس وہاں سے بھاگ کر ایتھنز چلا آیا اور یہیں رہنے لگا۔ یہاں اس کی حالت نہایت حقیر و ذلیل فقیروں کی طرح تھی۔ ہاتھ میں لکڑی لے کر ننگے پاؤں پھرتا اور پیٹھ پر ایک گٹھری رکھ کر سارے شہر کا گشت لگاتا۔ یہ اس کا روز کا معمول تھا۔ جس پر لوگ ہنستے اور مذاق اڑاتے تھے۔ خاص کر اس کی ڈاڑھی تو لوگوں کے لیے کشتِ زعفراں کی حیثیت رکھتی تھی اور ان کی ساری تضحیک اس پر صرف ہوا کرتی تھی۔

دیو جانس نے ابتدا میں اپنے اوپر کیفیت مسخ کو جس طریقہ سے طاری کیا تھا ہر چند اس کا انتقا یہی تھا کہ لوگ اسے دیوانہ سمجھتے لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس کی یہی دیوانگی اس قدر ہوشیاری تھی کہ تمام قلوب اس کی طرف منجذب ہو گئے۔ اور چند ہی روز میں وہ نہایت قابل قدر فلسفی تسلیم کر لیا گیا۔

اشاعت فلسفہ کے لیے اس نے جو عجیب عجیب طریقے اختیار کیے تھے ان کا درس اس نے جانوروں سے لیا تھا۔ چنانچہ چوہوں سے یہ سبق لیا کہ انسان کو کسی خاص مقام و مکان کی ضرورت نہیں جہاں اتفاق لے جائے وہیں قیام بھی ہو سکتا ہے۔ اسی لیے اس نے اپنے رہنے کے لیے کوئی مکان نہیں بنایا۔

بلکہ اپنے ساتھ ایک صندوق رکھنے لگا جسے آگے آگے لڑھکتا ہوا چلتا اور جب رات ہو جاتی تو اسی میں گھس جاتا۔

وحشی جانوروں سے اس نے یہ سیکھا کہ کھانا پکانے اور برتن وغیرہ رکھنے کی کوئی ضرورت نہیں، کچا گوشت ناخنوں سے نوچ کر کھایا جاسکتا ہے چنانچہ اس کا طرز عمل یہی تھا۔ اور سوائے ان صورتوں کے جبکہ وہ کسی دعوت میں شریک ہوتا۔ یا خاص مجمع میں مدعو کیا جاتا۔ اسی طرح ناخنوں سے نوچ نوچ کر کھاتا۔

کتوں سے اس نے یہ حقیقت حاصل کی کہ سنجیدگی و متانت یا پابندی رسوم کی کوئی ضرورت نہیں۔ تمام مطالب و مقاصد پورا کرنے کے لیے صرف آزادی و بیباکی درکار ہے۔ اگرچہ لوگ دیوجانس کی ان حرکتوں کو حیرت و استعجاب سے دیکھتے تھے۔ لیکن خود دیوجانس دوسروں پر افسوس کرتا تھا کہ وہ کیوں اس کے اصول پر عمل نہیں کرتے۔

کلبی کی عادت تھی کہ وہ دن کو بھی ایک قندیل اپنے ساتھ لے کر نکلتا۔ ہر اگر لوگ پوچھتے کہ یہ کس ضرورت سے ہے تو جواب دیتا کہ مجھے اپنے ایک ہم مشرب کی تلاش ہے۔ چنانچہ وہ لوگوں کو آواز دیتا اور اپنے پاس جمع کرتا۔ جب سب آجاتے تو ڈنڈا لے کر ان کو منتشر کر دیتا اور کہتا مجھے انسان کی تلاش ہے۔ اور تم میں سے کوئی انسان نہیں ہے۔ اس کے جواب میں اگر کوئی کہتا کہ "پھر آدمی کسے کہتے ہیں۔ تم نے کبھی آدمی دیکھا ہے؟" تو کہتا کہ "نہیں میں نے کوئی آدمی نہیں دیکھا البتہ اسپارٹا میں چند بچے دیکھے ہیں۔"

دیوجانس کا یہ جواب ٹھیک ہوتا اگر وہ انسانی حقیقت سے بھی واقفیت رکھتا لیکن اس کے حالات کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے اقوال صرف اوہام تھے۔ اور وہ لوگوں کے معائب پر ان کے محاسن سے

زیادہ غور و خوض کیا کرتا تھا۔

اس کی یہ عادت بھی تھی کہ موسم گرما میں جب سخت گرمی پڑنے لگتی تو دوپہر کے وقت خوب گرم ریت پر اور جب شدید جاڑے ہوتے تو برف کی چٹانوں پر لوٹتا۔ لوگ پوچھتے "یہ کیوں؟" تو کہتا "اس سے مجھے سردی و گرمی برداشت کرنے کی عادت پڑ جائے گی۔"

وہ ذی ثروت اور دولتمند اصحاب کی بے انتہا تحقیر کرتا۔ خطیبوں اور مقررین کو سمجھتا کہ یہ رعایا کے غلام ہیں۔ فلاطوں اور اس کے تلامذہ کے لیے اس کی رائے یہ تھی کہ وہ سب کے سب فضول خرچ تھے۔ اس کا قول تھا کہ بادشاہوں کے تاج ایسے ہیں جیسے شیشے کے برتن اور شہرت پسندی صرف دیوانوں کا نمونہ ہے وہ کہا کرتا کہ جب میں دنیا کے حکام، فلاسفہ و حکما، وغیرہ کو دیکھتا ہوں تو سمجھتا ہوں کہ واقعی انسان اپنے عقل و ادراک کے لحاظ سے جانوروں سے بالاتر ہے لیکن جب میں ان لوگوں کو دیکھتا ہوں جو وحی، الہام، تعبیر رویا کے مدعی ہیں یا ان لوگوں پر نظر پڑتی ہے جو مال و جاہ حاصل کرنے کے بعد متکبر و مغرور بن جاتے ہیں تو خیال کرتا ہوں کہ انسان سخت مجنون ہے اور اس لحاظ سے حیوانوں سے بھی زیادہ پست و ذلیل۔

ایک روز اس نے دیکھا کہ ایک لڑکا چلو سے پانی پی رہا ہے۔ اس نے اپنا چوبی پیالہ پھینک دیا اور کہا کہ یہ بچہ مجھ سے زیادہ ہوشیار اور صاحب بصیرت ہے۔

ایک روز بازار میں کھڑا ہوا وعظ کہہ رہا تھا۔ دیکھا تو پاس ایک متنفس بھی نہیں ہے۔ گانا بجانا شروع کر دیا پھر تو کیا تھا۔ لوگ پروانوں کی طرح اس کے گرد جمع ہو گئے تھوڑی دیر تک یہ حالت دیکھتا رہا اور اس کے بعد سب کو لعنت و ملامت

کرنے لگا۔ کہ افسوس ہے تم ایک لغویات کے لیے تو میرے گرد جمع ہو گئے، لیکن میرے نزدیں نصائح کی طرف مطلق توجہ نہیں کی۔

دیو جانس ان لوگوں کا سخت مخالف تھا جو موسیقی میں کوئی مہارت رکھتے تھے۔ وہ کہتا تھا کہ یہ لوگ بجائے اس کے کہ لوگوں کے خصائل میں صلاح، عادات میں استقلال تہذیب میں استقامت پیدا کریں۔ ان کو خوش اور لطف اندوز کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ چند دن میں وہ بیکار ہو جاتے ہیں۔ علمائے فلکیات اور اہل رصد کا بھی بڑا مخالف تھا اور کہا کرتا تھا کہ ان لوگوں کو اپنے پاؤں کے نیچے کا تو حال معلوم نہیں اور آسمان و اجرام سماوی کے حالات جاننے کے مدعی ہیں۔

خطیب اور واعظ حضرات سے بھی بیزار تھا۔ اس لیے کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں اس پر عمل نہیں کرتے۔ بخیلوں کا بھی دشمن تھا۔ ان کی نسبت اس کی یہ رائے تھی کہ ظاہر میں تو ان پر زہد و قناعت کے آثار ہوتے ہیں۔ لیکن دل میں صرف مال جمع کرنے اور دنیا کی حرص ہوتی ہے۔ جو لوگ معابد و ہیاکل میں جا کر طاعت و عبادت کرتے ہیں اور باہر نکل کر بلاہی و ملاعب میں شریک ہو جاتے ہیں۔ اُن سے بھی اسے سخت نفرت تھی۔ وہ کہتا تھا ایسے تو بہت لوگ میں نے دیکھے ہیں۔ جو مذاق اور فضولیات میں اپنا وقت ضائع کر دیتے ہیں مگر انسانی فضائل اور اخلاقی کمالات حاصل کرنے میں ایک منٹ بھی صرف نہیں کرتے۔

ایک روز دیو جانس ایسی جگہ پہونچا جہاں لڑکے کھیل رہے تھے خود بھی وہیں کھڑا ہو گیا۔ لڑکوں نے اُسے گالیاں دیکر نکال دیا تو چلا تو آیا۔ لیکن اُن سب کے نام بھی لکھ لایا تاکہ شہر میں گشت کر کے ان کا اعلان کرے۔

ایک مرتبہ لوگوں نے اس کے فقر و فاقہ پر ملامت کرنی اور شرم دلانی شروع

کی۔ اس نے کہا فقیر ملامت کا مستحق نہیں ہے بلکہ وہ لوگ ہیں جو مال دار ہیں اور رات دن قبائح اور رذائل میں مبتلا رہتے ہیں۔ وہ کہتا تھا کہ اچھی چیز وہ ہے جو سستی ہو۔ میں نے بسا اوقات سنگ مرمر کی تصویریں دیکھی ہیں، جو ہزاروں روپے میں فروخت ہوتی ہیں۔ لیکن ایک من گیہوں کے مقابلہ میں میں ان کی کوئی وقعت نہیں سمجھتا جو ایک روپیہ میں آجاتا ہے۔

ایک روز اُسے فیلقس مقدونی کے پاس پکڑلائے فیلیپس نے پوچھا "تم کون ہے۔؟" جواب دیا "تمھاری طرح ایک جاسوس"۔ اُس نے اس فقرہ کو بہت پسند کیا اور اُسے چھوڑ دیا۔

اس کا قول تھا کہ حکما، کو کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے تمام چیزیں اُن کے قبضہ میں ہیں۔ وجہ پوچھی گئی تو بتایا ہر چیز خدا کی ہے اور یہ لوگ خدا کے محبوب ہیں۔

ایک مرتبہ سکندر اس کی مُلاقات کو گیا اور دیکھا کہ وہ دُھوپ میں بیٹھا ہے اور اُس کا صندوق بھی سامنے پڑا ہے۔ سکندر نے اس کے پاس جا کر کہا "میں سکندر ہوں"۔ وہ بولا "میں دیو جانس کُتا ہوں"۔ سکندر نے کہا۔ "تم مجھ سے ڈرتے نہیں ہو؟" اس نے کہا "تم نیک ہو یا بد؟" اس نے جواب دیا "نیک"۔ کہنے لگا۔ "تو پھر نیک آدمی سے کیوں خوف کروں"۔ سکندر اس جواب سے بہت خوش ہوا پھر اس سے کہا کہ "تم اپنی کوئی حاجت میرے سامنے پیش کرو میں پوری کروں گا"۔ کہا "میرے سامنے سے ہٹ جاؤ تم نے دھوپ روک لی ہے"۔ اس نے کہا کہ "ہم دونوں میں کون زیادہ بے پرواہ ہے ایک کمبل اور ایک گٹھری والا یا وہ شخص جو اپنی وسیع سلطنت اور عظیم الشان حکومت پر قانع نہیں ہے۔ بلکہ بقیہ دنیا کو قبضہ میں لانے کے درپے ہے۔

اور مُفت میں اپنی جان کو خطرات میں ڈال رہا ہے"۔ سکندر کے رفقا بہت متعجب ہوئے۔ خاص کر جب انھوں نے دیکھا کہ باوجود اس شخص کی بیباکی اور جرأت کے سکندر کے دل میں کچھ اور عزت بڑھتی جا رہی ہے۔ سکندر نے اسی کو محسوس کیا اور اپنے رفقا کو مخاطب کر کے کہنے لگا "اگر آج میں سکندر نہ ہوتا تو دیوجانس ہوتا"۔

دیوجانس ایک مرتبہ جہاز کا سفر کر رہا تھا۔ دریائی ڈاکو آئے اور اسے پکڑ لے گئے اور جزیرہ کریٹ میں ایک غلام کی صورت سے بیچنے لگے۔ اس نے ایک موٹے شخص کو دیکھا جو اچھے وضع و لباس میں تھا۔ کہنے لگا مجھے اس کے ہاتھ بیچ دو۔ اس کو ایک معلم و مؤدب کی ضرورت ہے۔ اس شخص کا نام رینا ڈس تھا۔ دیوجانس اس شخص کی طرف بڑھا اور کہا بیٹے مجھے خرید لو۔ میں تمھیں تعلیم دوں گا اور ادب سکھاؤں گا۔ رینا ڈس نے پوچھا تم کیا جانتے ہو؟۔ بتایا میں تہذیب و ترتیب کے اُصول سے واقف ہوں۔ آخر کار رینا ڈس نے خرید لیا۔ جب اسے لے کر چلا تو دیوجانس نے کہا "میں تمھارا غلام تو ہو گیا ہوں مگر شرط یہ ہے کہ جو کچھ میں کہوں اس پر عمل کرنا"۔ رینا ڈس نے اُسے اپنے لڑکوں کا معلم مقرر کیا۔ دیوجانس نے بڑی کوشش سے ان کی تعلیم اور تربیت کی اور انھیں شعر گوئی، حکمت، پہلوانی، شکار اور تیر اندازی وغیرہ سکھائی۔ اور قناعت کرنے اور موٹا کپڑا پہننے کی انھیں ترغیب دی۔

ایک رُوز ایک شخص اس کے پاس آیا جو اُسے آزاد کرانا چاہتا تھا۔ دیوجانس نے اس سے کہا "تمھیں نہیں معلوم کہ وہ شخص جو شیر کو کھلاتا پلاتا ہے

خود شیر کا قیدی ہے۔ شیر اس کا قیدی نہیں ہوتا۔"

ایک شخص نے اس سے پوچھا کہ کھانے کے لیے کونسا وقت مناسب ہے
اس نے کہا کہ اگر تم مال دار ہو تو جب چاہو کھاؤ اور اگر فقیر ہو تو جب مل
جائے وہی وقت مناسب ہے۔

اس کی عجیب عادت یہ تھی کہ بجائے سر کے پاؤں میں خوشبو لگاتا تھا
لوگوں نے دیکھ کر پوچھا یہ کیا حرکت ہے؟ تو جواب دیا کہ سر میں خوشبو لگانا
فضول ہے۔ کیونکہ وہ ہوا کے ساتھ پھیل کر ضائع ہو جاتی ہے اور آدمی
اس سے زیادہ فائدہ نہیں اُٹھا سکتا اور اگر پاؤں میں لگائی جائے تو
اس سے ہر وقت فائدہ پہونچ سکتا ہے۔

ایک شخص نے اس سے کہا کہ اگر تم میری مُلاقات کو نہ آؤ گے تو
میں تمھیں قتل کر دوں گا۔ اس نے کہا یہ تو کوئی کمال کی بات نہیں۔ ایک
چھوٹا سا زہریلا کیڑا بھی یہ کام کر سکتا ہے۔

لوگوں نے اس سے پوچھا کہ لوگ اندھوں اور لنگڑوں کو دیتے ہیں
اور فلاسفہ کو نہیں دیتے اس کی کیا وجہ ہے اس نے جواب دیا کہ وہ ڈرتے
ہیں۔ کسی روز اندھے یا لنگڑے نہ ہو جائیں مگر فلسفی ہونے کا انھیں ذرا
بھی خوف نہیں۔

وہ کہتا تھا کہ جو لوگ وعظ و نصیحت کرتے ہیں اور خود اس پر عمل
نہیں کرتے وہ آلات موسیقی کی طرح ہیں۔ جن سے نہایت دل خوش کن
نغمات نکلتے ہیں اور خود وہ بے شعور اور بے حس ہیں۔

لوگوں نے اس سے کہا کہ جب تم مرو تو تمھیں کہاں دفن کریں؟ کہا جنگل میں ڈال دینا۔ لوگوں نے کہا درندے کھا جائیں گے۔ کہا میرے پاس ایک لکڑی رکھ دینا۔ اگر کوئی کھانے آئے گا تو بھگا دوں گا۔ لوگوں نے کہا کیا مرنے کے بعد بھی تم ایسا کر سکو گے؟ جواب دیا کہ میں کچھ نہ کر سکوں گا تو مجھے کوئی تکلیف بھی نہ ہوگی۔ پھر اس کی فکر کیا کہ میں کہاں دفن ہوں گا۔

دیوجانس کے اس قسم کے نوادر نہایت کثرت کے ساتھ منقول ہیں نوّے سال کی عمر میں اس نے انتقال کیا۔ مشہور یہ ہے کہ جس رُوز سکندر کا انتقال ہوا تھا اُسی رُوز اس نے بھی وفات پائی تھی۔
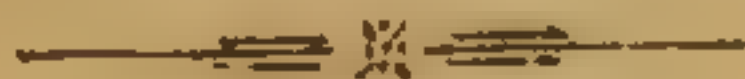
مولانا ابوالکلام آزاد

پیدائش ۱۸۸۸ء میں بمقام مکہ معظمہ ہوئی۔ آپ کے والد دہلی کے اور والدہ ماجدہ مدینہ منورہ کی رہنے والی تھیں آپ کے والد مولانا محمد خیرالدین صاحب ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان سے وداع ہو کر مکہ شریف میں مقیم ہو گئے تھے۔ عرصہ کے بعد تشریف لائے اور بمبئی۔ کاٹھیاواڑ۔ گجرات وغیرہ میں مقیم رہ کر کلکتہ میں آباد ہو گئے۔ آپ کو سن تعلیم کے شروع ہوتے ہی مذہبی تعلیم دی گئی۔ آپ بیحد ذہین تھے جو کچھ پڑھایا جاتا تھا وہ فوراً یاد کر لیتے تھے۔ عربی و فارسی میں ان کو عبور حاصل ہے۔ آپ اسلامی ادب کے بڑے ماہر بلکہ محقق ہیں۔ ۱۹۱۲ء سے آپ نے سیاسیات میں حصہ لیا۔

آپ کو عربی و فارسی کے عالم و فاضل ہونے کے سوا علوم اسلامی اور ادبیات پر عبور حاصل ہے۔ آپ نے کلکتہ سے "الہلال" اور "البلاغ" دو گرانقدر اخبارات جاری کیے تھے۔ مولانا کے مضامین اُردو فصاحت کی جان اور ایک بے مثل ادبی خزانہ ہیں۔ آپ نے اُردو میں ایک نیا طرز تحریر نکالا ہے جس نے موجودہ انشاپردازوں کی تحریر پر زبردست اثر ڈالا۔ آپ مشکل عربی الفاظ کو اس طرح استعمال کرتے ہیں کہ ان الفاظ کا ثقل دفع ہو جاتا ہے۔ مولانا کی

تحریر میں علمی شان ہے، شوکت ہے۔ رعنائی ہے اور ساتھ ہی ساتھ متانت اور بانکپن بھی ہے۔ آپ کا موضوع عام طور سے مذہب، فلسفہ اور تنقید ہے۔ آپ نے جدید علمی اصطلاحات بھی بکثرت وضع کی ہیں۔ آپ کے خطوط صرف مراسلہ یا مکاتبہ ہی نہیں ہیں بلکہ ایک بلند پایہ ادبی سرمایہ اور ایک مبصرانہ تنقید بھی ہیں جن کی دلچسپی ایک عمدہ ادبی مقالے سے کہیں زیادہ ہے۔ آپ کی طرز تحریر میں سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ جملے چاہے جتنے طویل ہوں لیکن روانی اور تسلسل میں کوئی فرق نہیں آتا بلکہ خطیبانہ بلند آہنگی سے بیان کی قدرت، شوکت اور عظمت پوری طرح ظاہر ہوتی ہے۔ مولانا کے تشبیہ و استعارے گو عربی و عجمی ہوتے ہیں لیکن وہ ان کو اس طرح پیوند ملاتے ہیں کہ وہ باوجود غیر ملکی ہونے کے بالکل اردو کی ملکیت معلوم ہوتے ہیں۔

مکتوب از غبار خاطر

(بنام مولانا حبیب الرحمٰن صدر یار جنگ مرحوم)

قلعہ احمد نگر۔ ۱۷ر دسمبر ۱۹۴۲ء

صدیقِ مکرم

وقت وہی ہے مگر افسوس وہ چائے نہیں ہے جو طبع شورش پسند کو سرمستیوں کی اور فکر عالم آشوب کو آسودگیوں کی دعوت دیا کرتی تھی۔

پھر دیکھیے انداز گل افشانی گفتار　　رکھ دے کوئی پیمانۂ صہبا مرے آگے

وہ چینی چائے جس کا عادی تھا۔ کئی دن ہوئے ختم ہوگئی، اور احمد نگر اور پونا کے بازاروں میں کوئی اس جنس گرانمایہ سے آشنا نہیں

یک نالۂ مستانہ زجائے نہ شنیدم
ویران شود آں شہر کہ مے خانہ ندارد

مجبوراً ہندوستان کی اُسی سیاہ پتی کا جوشاندہ پی رہا ہوں جسے تعبیر و تسمیہ کے اُس قاعدے کے بموجب کہ:۔

برعکس نہند نام زنگی کافور!

لوگ چائے کے نام سے پکارتے ہیں۔ اور دودھ ڈال کر اس کا گرم شربت بنایا کرتے ہیں:۔

درماندۂ صلاح و فسادیم، الحذر
زیں رسم ہا کہ مردم عاقل نہادہ اند!

اس کارگاہ سود و زیاں کی کوئی عشرت نہیں کہ کسی حسرت سے پیوستہ نہ ہو۔ یہاں زلال صافی کا کوئی جام نہیں بھرا گیا کہ دُردِ کدورت اپنی تہ میں نہ رکھتا ہو۔ بادۂ کامرانی کے تعاقب میں ہمیشہ خمار ناکامی لگا رہا۔ اور خندۂ بہار کے پیچھے ہمیشہ گریۂ خزاں کا شیون برپا ہوا۔

ابوالفضل کیا خوب کہہ گیا ہے ؎

قدحے پُر نہ شد کہ تہی نہ کردند　　و صفحہ تمام نہ شد کہ ورق برنگردید
نیکو نہ بود ہیچ مرادے بہ کمال　　چوں صفحہ تمام شد ورق برگردد

امید ہے کہ آپ کی "عنبریں" چائے کا ذخیرہ جس کا ایک مرتبہ رمضان میں آپ نے ذکر کیا تھا، اس نایابی کی گزند سے محفوظ ہوگا۔

امید کہ چوں بندہ تنک مایہ نباشی　　مے خوردن ہر روزہ ز عادات کرام است

معلوم نہیں، کبھی اس مسئلہ کے وقائق و معارف پر بھی آپ کی توجہ مبذول ہوئی یا نہیں؟ اپنی حالت کیا بیان کروں؟ واقعہ یہ ہے کہ وقت کے بہت سے مسائل کی طرح اس معاملہ میں بھی طبیعت کبھی سواد اعظم کے مسلک سے متفق نہ ہوسکی۔ زمانے کی بے راہ رویوں کا ہمیشہ ماتم گسار رہنا پڑا۔

از آں کہ پیروی خلق گمرہی آرد
نمی رویم براہے کہ کارواں رفتہ است

چائے کے باب میں ابنائے زمانہ سے میرا اختلاف صرف شاخوں اور پتوں کے معاملہ ہی میں نہیں ہوا کہ مفاہمت کی صورت نکل سکتی بلکہ سرے سے جڑ میں ہوا۔ یعنے اختلاف فرع کا نہیں، اصل الاصول کا ہے۔ ذہن کا ذکر کیا، یاں سر ہی غائب ہے گریبان سے!

سب سے پہلا سوال چائے کے بارے میں خود چائے کا پیدا ہوتا ہے۔ میں چائے کو چائے کے لیے پیتا ہوں۔ لوگ شکر اور دودھ کے لیے پیتے ہیں۔ میرے لیے وہ مقاصد میں داخل ہوئی۔ ان کے لیے وسایل میں۔ غور فرمائیے۔ میرا رُخ کس طرف ہے اور زمانہ کدھر جارہا ہے۔

تو و طوبےٰ و ما و قامت یار   فکر ہر کس بقدر ہمت اوست!

چائے چین کی پیداوار ہے اور چینیوں کی تصریح کے مطابق پندرہ سو برس سے استعمال کی جارہی ہے۔ لیکن وہاں کبھی کسی کے خواب و خیال میں بھی یہ بات نہیں گذری کہ اس جوہر لطیف کو دودھ کی کثافت سے آلودہ کیا جا سکتا ہے۔ جن جن ملکوں میں چین سے براہ راست گئی۔ مثلاً روس، ترکستان، ایران، وہاں بھی کسی کو یہ خیال نہیں گذرا۔ مگر سترھویں صدی میں جب انگریز اس سے آشنا ہوئے تو نہیں معلوم ان لوگوں کو کیا سوجھی۔ انھوں نے دودھ ملانے کی بدعت ایجاد کی اور چونکہ ہندوستان میں چائے کا رواج انہی کے ذریعہ ہوا، اس لیے یہ بدعت سیئہ یہاں بھی پھیل گئی۔ رفتہ رفتہ معاملہ یہاں تک پہونچ گیا کہ لوگ چائے میں دودھ ڈالنے کے بجائے دودھ میں چائے ڈالنے لگے۔ بنیاد ظلم در جہاں اندک بود۔ ہر آنکہ آمد براں مزید کرد۔ اب انگریز تو یہ کہہ کر الگ ہو گئے کہ زیادہ دودھ نہیں ڈالنا چاہیے، لیکن اس کے تخم فساد نے جو برگ و بار پھیلا دیے ہیں انھیں کون چھانٹ سکتا ہے؟ لوگ چائے کی جگہ ایک طرح کا سیال حلوہ کھاتے ہیں۔ کھانے کی جگہ پیتے ہیں۔ اور خوش ہوتے ہیں کہ ہم نے چائے پی لی۔ ان نادانوں سے کون کہے کہ

ہائے کمبخت تو نے پی ہی نہیں!

پھر ایک بنیادی سوال چائے کی نوعیت کا بھی ہے اور اس بارے

میں بھی ایک عجیب عالمگیر غلط فہمی پھیل گئی ہے۔ کس کس سے جھگڑیئے اور
کس کس کو سمجھائیے۔ ع۔ روز و شب عربدہ با خلقِ خدا نتوان کرد۔
عام طور پر لوگ ایک خاص طرح کی پتی کو جو ہندوستان۔ سیلون میں
پیدا ہوتی ہے۔ سمجھتے ہیں چائے ہے۔ اور پھر اس کی مختلف قسمیں
کرکے ایک کو دوسرے پر ترجیح دیتے ہیں۔ اور اس ترجیح کے بارے میں
باہم ردّ و کد کرتے ہیں۔ ایک گروہ کہتا ہے' سیلون کی چائے بہتر ہے
دوسرا کہتا ہے دارجلنگ کی بہتر ہے۔ گویا یہ بھی وہ معاملہ ہوا کہ:-

در رہِ عشق نہ شد کس بہ یقیں محرمِ راز
ہر کسے بر حسبِ فہم گمانے دارد

حالانکہ ان فریب خوردگانِ رنگ و بو کو کون سمجھائے کہ جس چیز پر
جھگڑ رہے ہیں وہ سرے سے چائے ہے ہی نہیں۔

چون نہ دیدند حقیقت رہِ افسانہ زدند

دراصل یہ عالمگیر غلطی اس طرح پیدا ہوئی کہ انیسویں صدی کے
اوائل میں جب چائے کی مانگ ہر طرف بڑھ رہی تھی ہندوستان کے
بعض انگریز کاشتکاروں کو خیال ہوا کہ سیلون اور ہندوستان کے
بلند اور مرطوب مقامات میں چائے کی کاشت کا تجربہ کریں۔ انہوں
نے چین سے چائے کے پودے منگوائے اور یہاں کاشت شروع کی۔
یہاں کی مٹی نے چائے پیدا کرنے سے تو انکار کر دیا مگر تقریباً اسی شکل
و صورت کی ایک دوسری چیز پیدا کر دی۔ ان زیاں کاروں نے اسی

کا نام چائے رکھ دیا۔ اور اس غرض سے کہ اصلی چائے سے ممتاز رہے، اسے کالی چائے کے نام سے پکارنے لگے ؎

غلطی ہائے مضامین مت پوچھ　　لوگ نالہ کو رسا باندھتے ہیں

دنیا جو اس جستجو میں تھی کہ کسی نہ کسی طرح یہ جنس کمیاب ارزاں ہو سب سمجھے بوجھے اسی پر ٹوٹ پڑی اور پھر تو گویا پوری نوعِ انسانی نے اس فریب خوردگی پر اجماع کر لیا۔ اب آپ ہزار سر پیٹئے، سنتا کون ہے۔

اسی کی سی کہنے لگے اہلِ حشر
کہیں پرسشِ داد خواہاں نہیں

معاملہ کا سب سے زیادہ دردانگیز پہلو یہ ہے کہ خود چین کے بعض ساحلی باشندے بھی اس عالمگیر فریب کی لپیٹ میں آ گئے، اور اسی پتی کو چائے سمجھ کر پینے لگے۔ یہ وہی بات ہوئی کہ بدخشانیوں نے لعلِ پتھر کو لعل سمجھا۔ اور کشمیریوں نے رنگی ہوئی گھانس کو زعفران سمجھ کر اپنی دستاریں رنگنی شروع کر دیں۔

چوں کفر از کعبہ برخیزد۔ کجا ماند مسلمانی

نوعِ انسانی کی اکثریت کے فیصلوں کا ہمیشہ ایسا ہی حال رہا ہے۔ جمعیت بشری کی یہ فطرت ہے کہ ہمیشہ عقلمند آدمی اکا دکا ہو گا۔ بھیڑ بے وقوفوں کی ہی ہو گی۔ ماننے پر آئیں گے تو گائے کو خدا مان لیں گے۔ انکار پر آئیں گے تو مسیح کو سولی پر چڑھا دیں گے حکیم سنائی زندگی بھر ماتم کرتا رہا!

گاؤ را دارند باور در خدائی عامیاں
نوح را باور نہ دارند از پئے پیغمبری

اس لیے عرفاء طریق کو کہنا پڑا ؎

انکار پئے خلق باش، تصدیق نیست — مشغول بہ خویش باش توفیق نیست
تبعیت خلق از حقت باطل کرد — ترک تقلید گیر، تحقیق نیست

یہ تو اصول کی بحث ہوئی۔ اب فروع میں آئیے۔ یہاں بھی کوئی گوشہ نہیں جہاں زمین ہموار ملے۔ سب سے اہم مسئلہ شکر کا ہے۔ مقدار کے لحاظ سے بھی، اور نوعیت کے لحاظ سے بھی ؎

در دا کہ طبیب صبر می فرماید — دین نفس حریص را شکر می باید

جہاں تک مقدار کا تعلق ہے۔ اسے میری محرومی سمجھئے یا تلخ کامی کہ مجھے مٹھاس کے ذوق کا بہت کم حصہ ملا ہے۔ نہ صرف چائے میں بلکہ کسی چیز میں بھی زیادہ مٹھاس گوارا نہیں کر سکتا۔ دنیا کے لیے جو چیز مٹھاس ہوئی۔ وہی میرے لیے بدمزگی ہوگئی۔ کھاتا ہوں تو منہ کا مزہ بگڑ جاتا ہے۔ لوگوں کو جو لذت مٹھاس میں ملتی ہے۔ مجھے نمک میں ملتی ہے۔ کھانے میں نمک پڑا ہو مگر میں اوپر سے اور چھڑک دوں گا۔ میں صباحت کا نہیں ملاحت کا قتیل ہوں و للناس فی ما یعشقون مذاھب! گویا کہہ سکتا ہوں کہ "اخی یوسف اصبح وانا املح منہ" کے مقام کا لذت شناس ہوں۔

گر نکتہ داں عشقی، خوش بشنو این حکایت۔ اس حدیث کے

تذکرے نے یاران قصص و مواعظ کی وہ خانہ ساز روایت یاد دلا دی کہ "الایمان حلوٌ والمومن یحب الحلویٰ" لیکن اگر مدارج ایمانی کے حصول اور مراتب ایقانی کی تکمیل کا یہی معیار ٹھہرا، تو نہیں معلوم اُن تہی دستان نقد حلاوت کا کیا حشر ہونے والا ہے، جن کی محبتِ حلاوت کی ساری پونجی چائے کی چند پیالیوں سے زیادہ نہیں ہوئی۔ اور ان میں بھی کم شکر پڑی ہوئی۔ اور پھر اس کم شکر پر بھی تاسف کہ نہ ہوتی تو بہتر تھا رہا۔ مولانا شبلی مرحوم کا بہترین شعر یاد آگیا ؎

دو دل بودن دریں رہ سخت تر عیبے ست سالک را
خجل ہستم ز کفر خود کہ دارد بوئے ایماں ہم

بچوں کا مٹھاس کا شوق ضرب المثل ہے۔ مگر آپ کو سن کر تعجب ہوگا کہ میں بچپنے میں بھی مٹھاس کا شائق نہ تھا۔ میرے ساتھی مجھے چھیڑا کرتے تھے کہ تجھے نیم کی پتیاں چبانی چاہئیں۔ اور ایک مرتبہ پسی ہوئی پتیاں کھلا بھی دی تھیں ؎

اسی باعث سے دایہ طفل کو افیون دیتی ہے کہ تا ہو جائے لذت آشنا تلخیٔ دوراں سے

میں نے یہ دیکھ کر کہ مٹھاس کا شائق نہ ہونا نقص سمجھا جاتا ہے۔ کئی بار بہ تکلف کوشش کی کہ اپنے آپ کو شائق بناؤں۔ مگر ہر مرتبہ ناکام رہا۔ گویا وہی بات ہوئی ؎

مرا دلے ست بہ کفر آشنا، کہ چندیں بار بہ کعبہ بردم و بازش برہمن آوردم

بہر حال یہ تو شکر کی مقدار کا مسئلہ تھا۔ مگر معاملہ اس پر ختم کہاں ہوتا ہے ع کو نہ نظر بیں کہ سخن مختصر گرفت۔ ایک دقیق سوال اس کی نوعیت کا بھی ہے۔ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ جو شکر ہر چیز میں ڈالی جاسکتی ہے وہی چائے میں بھی ڈالنی چاہیے۔ اس کے لیے کسی خاص شکر کا اہتمام ضروری نہیں۔ چنانچہ باریک دانوں کی دوبارہ شکر جو پہلے جاوٗ اور ماریشس سے آتی تھی اور اب ہندوستان میں بننے لگی ہے۔ چائے کے لیے بھی استعمال کی جاتی ہے۔ حالانکہ چائے کا معاملہ دوسری چیزوں سے بالکل مختلف واقع ہوا ہے۔ اسے حلوہ پر قیاس نہیں کرنا چاہیے۔ اس کا مزاج اسی قدر لطیف اور بے میل ہے کہ کوئی چیز بھی جو خود اسی کی طرح صاف و لطیف نہ ہوگی فوراً اسے مکدر کر دے گی۔ گویا چائے کا معاملہ بھی وہی ہوا کہ۔ نسیم صبح جو چھو جائے۔ رنگ ہو میلا۔

یہ دوبارہ شکر اگرچہ صاف کیے ہوئے رس سے بنتی ہے مگر پوری طرح صاف نہیں ہوتی۔ اس غرض سے کہ مقدار کم نہ ہو جائے صفائی کے آخری مراتب چھوڑ دیے جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ جونہی اسے چائے میں ڈالیے۔ معاً اس کا ذائقہ متاثر اور لطافت آلودہ ہو جائے گی۔ اگرچہ یہ اثر حال میں پڑتا ہے۔ تاہم دودھ کے ساتھ پیجیے تو چنداں محسوس نہیں ہوتا۔ کیونکہ دودھ کے ذائقہ کی گرانی چائے کے ذائقہ پر غالب آجاتی ہے اور کام چل جاتا ہے۔ لیکن سادہ چائے پیجیے تو فوراً بول اٹھے گی۔ اس کے لیے ایسی شکر چاہیے جو بلور کی طرح بے میل اور

برف کی طرح شفاف ہو۔ ایسی شکر ڈلیوں کی شکل میں بھی آتی ہے اور بڑے دانوں کی شکل میں بھی رہیں ہمیشہ بڑے دانوں کی شفاف شکر کام میں لاتا ہوں۔ اور اس سے وہ کام لیتا ہوں جو مرزا غالب گلاب سے لیا کرتے تھے۔

آسودہ باد خاطر غالب کہ خوئے اوست
آمیختن بہ بادۂ صافی گلاب را

میرے لیے شکر کی نوعیت کا یہ فرق ویسا ہی محسوس اور نمایاں ہوا جیسے شربت پینے والوں کے لیے قند اور گڑ کا فرق ہوا۔ لیکن یہ عجیب مصیبت ہے کہ دوسروں کو کسی طرح بھی محسوس نہیں کرا سکتا۔ جس کسی سے کہا اس نے یا تو میرے ہی منہ کا مزہ بگڑ گیا ہے۔ یا دنیا میں کسی کے منہ کا مزہ درست نہیں۔ یہ نہ بھولیے کہ بحث چائے کے تکلفات میں نہیں ہے۔ اس کی لطافت و کیفیت کے ذوق و احساس میں ہے۔ بہت سے لوگ چائے کے لیے صاف ڈلیاں اور موٹی شکر استعمال کرتے ہیں اور یورپ میں تو زیادہ تر ڈلیوں ہی کا رواج ہے مگر یہ اس لیے نہیں کیا جاتا کہ چائے کے ذائقہ کے لیے یہ کوئی ضروری چیز ہوئی بلکہ محض تکلف کے خیال سے کیونکہ اس طرح کی شکر نسبتاً قیمتی ہوتی ہے آپ انھیں معمولی شکر ڈال کر چائے دیدیجئے۔ بے غل و غش پی جائیں گے اور ذائقہ میں کوئی تبدیلی محسوس نہیں کریں گے۔

شکر کے معاملہ میں اگر کسی گروہ کو حقیقت آشنا پایا تو وہ ایرانی ہیں۔ اگرچہ چائے کی نوعیت کے بارے میں چنداں ذی حس نہیں مگر

یہ نکتہ انھوں نے پا لیا ہے۔ عراق اور ایران میں عام طور پر یہ بات نظر آتی ہے کہ چائے کے لیے قند کی جستجو میں رہتے تھے اور اسے معمولی شکر پر ترجیح دیتے تھے کیونکہ قند صاف ہوتی ہے اور وہی کام دیتی ہے جو موٹے دانوں کی شکر سے لیا جاتا ہے۔ کہہ نہیں سکتا کہ اب وہاں کا کیا حال ہے۔

اور اگر "تعرف الاشیاء باضدادہا" کی بنا پر پوچھیے کہ چائے کے معاملہ میں سب سے زیادہ خیرہ مذاق گروہ کون ہے؟ تو میں بلاتامل انگریزوں کا نام لوں گا۔ یہ عجیب بات ہے کہ یورپ اور امریکہ میں چائے انگلستان کی راہ سے گئی اور دنیا میں اس کا عالمگیر رواج بھی بہت کچھ انگریزوں ہی کا منت پذیر ہے تاہم یہ نزدیکان بے بصر حقیقت حال سے اتنے دور جا پڑے کہ چائے کی حقیقی لطافت و کیفیت کا ذوق انھیں چھو بھی نہیں گیا۔ جب اس راہ کے اماموں کا یہ حال ہے تو ان کے مقلدوں کا جو حال ہوگا۔ معلوم ہے۔

آشنا را حال ایں ست وائے بر بیگانہ

انھوں نے چین سے چائے پینا تو سیکھ لیا مگر اور کچھ نہ سیکھ سکے۔ اول تو ہندوستان اور سیلون کی سیاہ پتی ان کے ذوق چائے نوشی کا منتہا کمال ہوا پھر قیامت یہ ہے کہ اس میں بھی ٹھنڈا دودھ ڈال کر اسے یک قلم گندہ کر دیں گے۔ مزید ستم ظریفی دیکھیے کہ اس گندے مشروب کی معیار سنجیوں کے لیے ماہرین فن کی ایک پوری فوج موجود رہتی ہے۔

کوئی ان زیاں کاروں سے پوچھے کہ اگر چائے نوشی سے مقصود انھیں پتیوں کو گرم پانی میں ڈال کر پی لینا ہے تو اس کے لیے ماہرین فن کی دقیقہ سنجیوں کی کیا ضرورت ہے؟ جو پتی بھی پانی کو سیاہی مائل کر دے اور ایک تیز بو پیدا ہو جائے۔ چائے ہے۔ اور اس میں ٹھنڈے دودھ کا ایک چمچہ ڈال کر کافی مقدار میں گندگی پیدا کر دی جا سکتی ہے۔ چائے کا ایک ماہر فن بھی اس سے زیادہ کیا خاک بتلائے گا۔ ع :۔ ہیں یہی کہنے کو وہ بھی اور کیا کہنے کو ہیں۔

اگرچہ فرانس اور بر اعظم میں زیادہ تر رواج کافی کا ہوا۔ تاہم اعلیٰ طبقہ کے لوگ چائے کا بھی شوق رکھتے ہیں۔ اور ان کا ذوق بہر حال انگریزوں سے بدرجہا بہتر ہے۔ وہ زیادہ تر چینی چائے پئیں گے۔ اور اگر سیاہ چائے پئیں گے بھی تو اکثر حالتوں میں بغیر دودھ کے یا لیموں کی ایک قاش کے ساتھ جو چائے کی لطافت کو نقصان نہیں پہونچاتی بلکہ اور نکھار دیتی ہے۔ یہ لیموں کی ترکیب دراصل روس، ترکستان اور ایران سے چلی۔ سمرقند اور بخارا میں عام دستور ہے کہ چائے کا تیسرا فنجان لیمونی ہوگا۔ بعض ایرانی بھی دَور کا خاتمہ لیمونی ہی پر کرتے ہیں یہ کمبخت دودھ کی آفت تو صرف انگریزوں کی لائی ہوئی ہے۔

سرِ ایں فتنہ زجائیست کہ من می دانم

اب ادھر ایک اور نئی مصیبت پیش آگئی ہے۔ اب تک تو صرف شکر کی عام قسم ہی کے استعمال کا رونا تھا لیکن اب معاملہ صاف صاف

گڑ تک پہونچنے والا ہے۔ ہندوستان قدیم میں جب لوگوں نے گڑ کی منزل سے قدم آگے بڑھانا چاہا تھا تو یہ کیا تھا کہ گڑ کو کسی قدر صاف کر کے لال شکر بنانے لگے تھے۔ یہ صفائی میں سفید شکر سے منزلوں دُور تھی مگر ناصاف گڑ سے ایک قدم آگے نکل آئی تھی۔ پھر جب سفید شکر عام طور پر بننے لگی تو اِس کا استعمال زیادہ تر دیہاتوں میں محدود رہ گیا لیکن اب پھر دنیا اپنی ترقی معکوس میں اسی طرف لوٹ رہی ہے جہاں سے سیکڑوں برس پہلے آگے بڑھی تھی۔ چنانچہ آجکل امریکہ میں اس لال شکر کی بڑی مانگ ہے۔ وہاں کے اہل ذوق کہتے ہیں کافی بغیر اس شکر کے مزہ نہیں دیتی اور جیسا کہ قاعدۂ مقررہ ہے اب ان کی تقلید میں یہاں کے اصحاب ذوق بھی "براؤن شوگر" کی صدائیں بلند کرنے لگے ہیں۔ میری یہ پیشین گوئی لکھ رکھیے کہ عنقریب یہ براؤن شکر کا ہلکا سا پردہ بھی اٹھ جائے گا اور صاف صاف گڑ کی مانگ ہر طرف شروع ہو جائے گی۔ یاران ذوق جدید کہیں گے کہ گڑ کے ڈلے ڈالے بغیر نہ چائے مزہ دیتی ہے نہ کافی۔ فرمایئے اب اس کے بعد کیا باقی رہ گیا ہے جس کا انتظار کیا جائے؟ وائے گر در پس امروز بود فردائے۔

شکر اور گڑ کی دنیائیں اس درجہ ایک دوسرے سے مختلف واقع ہوئی ہیں کہ آدمی ایک کا ہو کر پھر دوسرے کے قابل نہیں رہ سکتا میں نے دیکھا ہے کہ جن لوگوں نے زندگی میں دو چار مرتبہ بھی گڑ کھالیا شکر کی لطافت کا احساس پھر ان میں باقی نہیں رہا۔ جواہر لال چونکہ

مٹھاس کے بہت شائق ہیں۔ اس لیے گڑ کا بھی شوق رکھتے ہیں۔ میں نے
یہاں ہزار کوشش کی کہ شکر کی نوعیت کا یہ فرق جو میرے لیے اس
درجہ نمایاں ہے انھیں بھی محسوس کراؤں۔ لیکن نہ کرا سکا اور بالآخر
تھک کر رہ گیا۔ بہرحال زمانہ کی حقیقت فراموشیوں پر کہاں تک ماتم
کیا جائے۔ ع:۔ کوتہ نہ تواں کرد کہ ایں قصہ دراز است
آئیے آپ کو کچھ اپنا حال سناؤں۔ اصحابِ نظر کا قول ہے کہ حسن اور
فن کے معاملہ میں حب الوطنی کے جذبہ کو دخل نہیں دینا چاہیے۔
متاعِ نیک ہر دکان کہ باشد۔ پر عمل کرنا چاہیے۔ چنانچہ میں بھی
چائے کے باب میں شاہدانِ ہند کا نہیں خوبانِ چین کا معتقد ہوں ؎

دوائے دردِ دلِ خود ازاں مفرح جوئے
کہ در صراحیٔ چینی و شیشۂ حلبی ست

میرے جغرافیہ میں اگر چین کا ذکر کیا گیا ہے تو اس لیے نہیں کہ جنرل
چنگ کائی شیک اور میڈم چنگ وہاں سے آئے تھے بلکہ اس لیے
کہ چائے وہیں سے آتی ہے۔

مئے معانی ز فرنگ آید و شاید ز تتار
ما نہ دانیم کہ بطحاے و بغدادے ہست

ایک مدت سے جس چینی چائے کا عادی ہوں وہ وہائٹ جیسمین
(White Jasmine) کہلاتی ہے یعنی "یاسمن سفید"
یا ٹھیٹ اردو میں یوں کہیے کہ "گوری چنبیلی"

کسیکہ محرم راز صبا ست، می داند
کہ باوجود خزاں بوئے یاسمیں باقی ست

اس کی خوشبو جس قدر لطیف ہے اتنا ہی کیف تند و تیز ہے۔ رنگت کی نسبت کیا کہوں؟ لوگوں نے آتش سیال کی تعبیر سے کام لیا ہے۔

مے میانِ شیشۂ ساقی نگر آتشے گویا بہ آب آلودہ اند

لیکن آگ کا تخیل پھر ارضی ہے اور اس چائے کی علویت کچھ اور چاہتی ہے۔ میں سورج کی کرنوں کو مٹھی میں بند کرنے کی کوشش کرتا ہوں اور کہتا ہوں کہ یوں سمجھیے جیسے کسی نے سورج کی کرنیں حل کر کے بلّورین فنجان میں گھول کر دی ہوں۔ ملا محمد مازندرانی صاحب "بُت خانہ" نے اگر یہ چائے پی ہوتی تو خان خاناں کی خانہ ساز شراب کی مدح میں ہرگز یہ نہ کہتا۔

نہ می ماند ایں بادہ اصلاً بہ آب تو گوئی کہ حل کردہ اند آفتاب

لڑائی کی وجہ سے جہازوں کی آمد و رفت بند ہوئی تو اس کا اثر چائے پر بھی پڑا۔ میں کلکتہ کے جس چینی اسٹور سے منگوایا کرتا تھا۔ اس کا ذخیرہ جواب دینے لگا تھا۔ پھر بھی چند ڈبّے مل گئے تھے اور بعض چینی دوستوں نے بطور تحفہ کے بھی بھیج کر چارہ سازی کی تھی۔ جب کلکتہ سے نکلا تو ایک ڈبہ ساتھ تھا۔ ایک گھر میں چھوڑ آیا تھا۔ بمبئی سے گرفتار کر کے یہاں لایا گیا تو سامان کے ساتھ وہ بھی آ گیا اور پھر قبل اس کے

کہ ختم ہو۔ گھر والا ٹی پاٹ بھی پہونچ گیا۔ اس طرح یہاں اور چیزوں کی کتنی ہی کمی محسوس ہوئی ہو۔ لیکن چائے کی کمی محسوس نہیں ہوئی اور اگر چائے کی کمی محسوس نہیں ہوئی تو نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ کسی چیز کی کمی بھی محسوس نہیں ہوئی۔

حافظ دگر چہ می طلبی از نعیم دہر   مے می خوری وطرۂ دلدار می کشی

اس کی فکر کبھی نہیں ہوئی کہ یہ آخری ڈبہ چلے گا کب تک؟ کیونکہ خواجہ شیراز کی موعظت ہمیشہ پیش نظر رہتی ہے۔

تا ساغرت پُر است بنوشان و نوش کن

یہاں ہمارے زندانیوں کے قافلہ میں اس جنس کا شناسا کوئی نہیں ہے۔ اکثر حضرات دودھ اور دہی کے شائق ہیں اور آپ سمجھ سکتے ہیں کہ دُودھ اور دہی کی دُنیا چائے کی دُنیا سے کتنی دُور واقع ہوئی ہے؟ عمریں گذر جائیں پھر بھی یہ مسافت طے نہیں ہو سکتی۔ کہاں چائے کے ذوق لطیف کا شہرستان کیف و سرور اور کہاں دودھ اور دہی کی شکم پُری کی نگری!

اک عمر چاہیے کہ گوارا ہو نیش عشق   رکھی ہے آج لذت زخم جگر کہاں

جواہر لال بلاشبہ چائے کے عادی ہیں اور چائے پیتے بھی ہیں خواص یورپ کی ہم مشربی کے ذوق میں بغیر دودھ کی لیکن جہاں تک چائے کی نوعیت کا تعلق ہے شاہراہ عام سے باہر قدم نہیں نکال سکتے اور ابھی لیپچو دیپچو ہی کی قسموں پر قانع رہتے ہیں ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں ان حضرات کو اس چائے کے پینے کی زحمت دینا

نہ صرف بے سود تھا بلکہ "وضع الشئی فی غیر محلہ" کے حکم میں داخل تھا

مے بہ زاہد مکن عرضہ کہ ایں جوہر ناب ۔۔۔ پیش ایں قوم بہ شورابۂ زمزم نہ رسد

ان حضرات میں صرف ایک صاحب ایسے نکلے جنھوں نے ایک مرتبہ میرے ساتھ سفر کرتے ہوئے یہ چائے پی تھی اور محسوس کیا تھا کہ اگرچہ بغیر دودھ کی ہے مگر اچھی ہے۔ یعنے بہتر چیز تو وہی دودھ والا گرم شربت ہوا جو وہ روز پیا کرتے ہیں، مگر یہ بھی چنداں بُری نہیں۔ زمانہ کی عالمگیر خیرہ مذاقی دیکھتے ہوئے۔ یہ ان کی صرف "اچھی ہے" کی داد بھی مجھے اتنی غنیمت معلوم ہوئی کہ کبھی کبھی انھیں بلا لیا کرتا تھا کہ آیئے، اس "اچھی ہے" کی بھی پی لیجئے۔

عمرت دراز باد کہ ایں ہم غنیمت است

اُن کے لیے یہ صرف "اچھی" ہوئی۔ یہاں چائے کا سارا معاملہ ہی ختم ہو جائے اگر یہ "اچھی ہے" ختم ہو جائے۔ غالب کیا خوب کہہ گیا ہے:

زاہد از ما خوشۂ تاکے بہ چشم کم مبیں ۔۔۔ ہیں نہ می دانی کہ یک پیمانہ نقصاں کردہ ایم

مگر ایک ڈبہ کب تک کام دے سکتا تھا؟ آخر ختم ہونے پر آیا۔ چلیتہ خاں نے یہاں دریافت کرایا۔ پونا بھی لکھا۔ لیکن اس قسم کی چائے کا کوئی سُراغ نہیں ملا۔ اب بمبئی اور کلکتہ لکھوایا ہے دیکھیے کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ ایک ہفتہ سے وہی ہندوستانی سیاہ پتی پی رہا ہوں اور مستقبل کی اُمیدوں پر جی رہا ہوں۔

نہ کنی چارۂ لب خشکِ مسلمانے را ۔۔۔ اے بہ ترسا بچگاں کردہ مئے ناب سبیل

آجکل چینی ہندوستان کے تمام شہروں میں پھیل گئے ہیں اور ہر جگہ چینی رسٹوران کھل گئے ہیں۔ چونکہ احمد نگر انگریزی فوج کی بڑی چھاؤنی ہے اس لیے یہاں بھی ایک چینی رسٹوران کھل گیا ہے۔ جیلر کو خیال ہوا کہ ان لوگوں کے پاس یہ چائے ضرور ہوگی۔ اس نے خالی ڈبہ بھیج کر دریافت کرایا۔ انھوں نے ڈبہ دیکھتے ہی کہا کہ یہ چائے اب کہاں مل سکتی ہے۔ لیکن تمھیں یہ ڈبہ کہاں سے ملا؟ اور اس چائے کی یہاں ضرورت کیا پیش آئی؟ کیا چین کا کوئی بڑا آدمی یہاں آرہا ہے؟ جو وارڈر بازار گیا تھا اس نے ہر چند باتیں بنائیں مگر ان کی تشفی نہیں ہوئی۔ دوسرے دن سارے شہر میں یہ اڑواہ پھیل گئی کہ میڈم چینگ کائی شیک قلعہ کے قیدیوں سے ملنے آرہی ہے اور اس کے لیے چینی چائے کا اہتمام کیا جارہا ہے۔

ببیں کہ نقش ِ املہا چہ باطل فتادست!

چائے کے ڈبے کی تہہ میں ہمیشہ کچھ نہ کچھ پتیوں کا چورا بیٹھ جایا کرتا ہے اور اسے ڈبہ کے ساتھ پھینک دیا کرتے ہیں۔ یہ آخری ڈبہ ختم ہونے پر آیا تو تھوڑا سا چورا اس کی تہہ میں بھی جمع تھا۔ میں نے چھوڑ دیا کہ اسے کیا کام میں لاؤں۔ لیکن چیتہ خاں نے دیکھا تو کہا، آجکل لڑائی کی وجہ سے "ضائع مت کرو" کا نعرہ زبانوں پر ہے یہ چورا بھی کیوں نہ کام میں لایا جائے؟ میں نے بھی سوچا کہ:-

بہ ذرد و صاف ترا حکم نیست، دم درکش　　کہ ہر چہ ساقی ما ریخت عین الطاف ست

چنانچہ یہ چورا بھی کام میں لایا گیا۔ اور اس کا ایک ایک ذرّہ دم دے کر پیتا رہا۔ جب فنجان میں چائے ڈالتا تھا تو ان ذرّوں کی زبان حال پکار رہی تھی۔

ہر چند کہ نیست رنگ و بوئیم آخر نہ گیاہ باغ ادیم

اس تخیل نے کہ ان ذرّوں کے ہاتھ سے کیف و سرور کا جام لے رہا ہوں توسنِ فکر کی جولانیوں کے لیے تازیانہ کا کام دیا اور اچانک ایک دوسرے ہی عالم میں پہونچا دیا۔ مرزا بیدل نے میری زبانی کہا تھا:۔

اگر دماغ درِیں شبستاں خمارِ شرم عدم نہ گیرد
زچشمکِ ذرّہ جام گیرم بہ آں شکوہے کہ جم نہ گیرد

اس تجربہ کے بعد بے اختیار یہ خیال آیا کہ اگر ہم تشنہ کاموں کی قسمت میں اب سر جوش خم کی کیفیتیں نہیں رہی ہیں۔ تو کاش اس تہ شیشۂ ناصاف ہی کے چند گھونٹ مل جایا کریں۔ غالب نے کیا خوب کہا ہے:۔

کہتے ہوے ساقی سے حیا آتی ہے ورنہ یوں ہے کہ مجھے دُردِ تہِ جام بہت ہے

شکر کے مسئلہ نے بھی یہاں آتے ہی سر اٹھایا تھا۔ مگر مجھے فوراً اس کا حل مل گیا۔ اور اب اس طرف سے مطمئن ہوں۔ موٹے دانوں کی صاف شکر تھوڑی سی میرے سفری سامان میں تھی جو کچھ دنوں تک چلتی رہی جب ختم ہو گئی تو میں نے خیال کیا کہ یہاں ضرور مل جائے گی۔ نہیں ملی تو ڈلیوں کے بکس تو ضرور مل جائیں گے۔ لیکن جب بازار میں دریافت کرایا تو معلوم ہوا امن کے وقتوں میں بھی یہاں ان چیزوں

کی مانگ نہ تھی۔ اور اب کہ جنگ کی رکاوٹوں نے راہیں روک دی ہیں۔ ان کا سراغ کہاں مل سکتا ہے۔ مجبوراً مصری منگوائی اور چاہا کہ اُسے کٹوا کر شکر کی طرح کام میں لاؤں۔ لیکن کوٹنے کے لیے ہاون کی ضرورت ہوئی۔ جیلر نے کہا۔ ایک ہاون اور ہاون دستہ منگوا دیا جائے۔ دوسرے دن معلوم ہوا کہ یہاں نہ ہاون ملتا ہے نہ دستہ۔ حیران رہ گیا کہ کیا اس بستی میں کبھی کسی کو اپنا سر پھوڑنے کی ضرورت پیش نہیں آتی؟ آخر لوگ زندگی کیسے بسر کرتے ہیں؟

حدیث عشق چہ داند کسے کہ درہمہ عمر ❊ بسر نہ کوفتہ باشد در سرائے را

مجبوراً میں نے ایک دوسری ترکیب نکالی ایک صاف کپڑے میں مصری کی ڈلیاں رکھیں اور بہت سارڈی کاغذ اوپر تلے دھر دیا۔ پھر ایک پتھر اٹھا کر ایک قیدی کے حوالہ کیا۔ جو یہاں کام کاج کے لیے لایا گیا ہے۔ کہ اپنے سر کی جگہ اُسے پیٹ۔

ودیں کہ کوہکن از ذوق داد جاں چہ سخن ❊ ہمیں کہ تیشہ بسر زد سخن باقی ست

لیکن یہ گرفتار آلات و وسائل بھی کچھ ایسا۔ ع۔ سر گشتۂ خمار رسوم و قیود تھا کہ ایک چوٹ بھی قرینہ کی نہ لگا سکا۔ مصری تو کٹنے سے رہی۔ البتہ کاغذ کے پرزے پرزے اُڑ گئے۔ اور کپڑے نے بھی اُس کے روئے صبح کا نقاب بننے سے انکار کر دیا۔

چلی تھی برچھی کسی پر کسی کے آن لگی

بہرحال کئی دنوں کے بعد خدا خدا کر کے ہاون کا چہرۂ زشت نظر آیا" زشت"

اس لیے کہتا ہوں کہ کبھی ایسا نکمّا ظرف نظر سے نہیں گذرا تھا۔ آج کل ٹاٹا نے ایک کتاب شائع کی ہے یہ خبر دیتی ہے کہ ہزاروں برس پہلے وسط ہند کے ایک قبیلہ نے ملک کو لوہے اور لوہاری کی صنعت سے آشنا کیا تھا۔ عجب نہیں یہ ہاون بھی اُسی قبیلہ کی دستکاریوں کا بقیہ ہو۔ اور اس انتظار میں گردش لیل ونہار کے دن گنتا رہا ہو کہ کب قلعہ احمد نگر کے زندانیوں کا قافلہ یہاں پہونچتا ہے اور کب ایسا ہوتا ہے کہ انھیں سر پھوڑنے کے لیے تیشہ کی جگہ ہاون دستہ کی ضرورت پیش آتی ہے۔

شوریدگی کے ہاتھ سے ہے سر وبالِ دوش
صحرا میں اے خدا کوئی دیوار بھی نہیں

خیر یہ ہوا مصری کوٹنے کی راہ نکل آئی۔ لیکن اب کٹی ہوئی مصری موجود ہے، تو وہ چیز موجود نہیں جس میں مصری ڈالی جائے۔

اگر دستے کنم پیدا نمی یابم گریباں را

دیکھئے۔ صرف اتنی بات کہنی چاہتا تھا کہ چائے ختم ہو گئی مگر بائیس ۲۲ صفحے تمام ہو چکے اور ابھی تک بات تمام نہیں ہوئی۔

یک حرف بیش نیست سراسر حدیث شوق
ایں طرفہ ترکہ ہیچ بہ پایاں نمی رسد!

ابوالکلام

مولانا عبدالماجد دریا آبادی

سنہ ۱۸۹۳ء کو قصبہ دریا آباد ضلع بارہ بنکی میں پیدا ہوئے۔ آپکے والد ماجد مولوی عبدالقادر ڈپٹی کلکٹر تھے۔ مولانا نے ابتدائی تعلیم سیتاپور میں حاصل کی اور سنہ ۱۹۱۲ء میں کیننگ کالج لکھنؤ سے بی۔ اے کیا۔ چند ماہ علی گڈھ کالج میں بھی تعلیم حاصل کی لیکن والد ماجد کے انتقال کے باعث واپس لکھنؤ چلے آئے۔ سنہ ۱۹۱۷ء میں عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد کے دارالترجمہ میں ملازمت کر لی۔ لیکن زیادہ عرصہ یہ خدمات بھی انجام نہ دے سکے

مولانا کی علمی خدمات بہت زیادہ ہیں۔ اردو ادب پر آپ کے جو احسانات ہیں ان کو کبھی بھلایا نہیں جا سکتا۔ آپ کا دلچسپ مضمون فلسفہ ہے جس پر آپ نے بہت کچھ لکھا ہے۔ آپکی تصانیف میں "فلسفہ جذبات" "فلسفہ اجتماع" "تاریخ اخلاق یورپ" اور "مکالمات برکلے" بہت مشہور ہیں۔ اب آخری دور میں آپنے قرآن پاک کا انگریزی ترجمہ اور ساتھ ہی جامع تفسیر بھی لکھی ہے۔ عرصہ تک لکھنؤ سے ہفتہ وار اخبار "سچ" نکالتے رہے۔ انگریزی حکومت کے عہد میں بعض قانونی گرفتوں کے باعث اخبار بند ہو گیا۔ اب چند سال سے "صدق" جاری کیا ہے۔ لیکن وہ بھی حوادثات زمانہ کا شکار ہوا۔ پھر بھی مولانا کی بلند ہمتی اور خدمت زبان و ادب کا جذبہ جلد ہی "صدق جدید" کی صورت میں ظاہر ہوا۔ یہ ہفتہ وار اخبار دریا آباد سے نکلتا ہے۔ اردو میں آپکا طرز تحریر انوکھا اور دلچسپ ہے۔ زبان پر بڑی قدرت حاصل ہے۔ عبارت میں گفتگو کا لطف ہوتا ہے۔ قدرت نے آپ کو بڑی زبردست تنقیدی قوت عطا فرمائی ہے۔ معمولی واقعات کو اتنے لطیف پیرایے میں اور اتنے مؤثر انداز سے پیش کرتے ہیں کہ پڑھنے والا سراپا تاثر بن جاتا ہے۔ مولانا کا قلم آج بھی پورے جوش و خروش کے ساتھ اردو ادب کی خدمت میں مصروف ہے۔ آپکی بے لاگ تنقیدیں اور معرکۃ الآرا تبصرے اس قدر مقبول ہیں کہ اہل ذوق ہر ہفتہ صدق جدید کا بڑی بے چینی سے انتظار کرتے ہیں۔

محمد علی کو دنیا نے اوّل اوّل جانا، تو اس حیثیت سے کہ انگریزی لکھتے خوب ہیں، بولتے خوب ہیں، علی گڑھ کے فدائی ہیں، "قوم" کے شیدائی ہیں، مخلص ہیں، پرجوش ہیں، ابھی کالج ہی میں تھے کہ شہرت نے بلائیں لینی شروع کر دیں۔ آکسفورڈ گئے، نام اور چمکا، ہندوستانی طلبہ کی مجلس "نورتن" کے نام سے قایم کی، خود ہی صدر بنائے گئے۔ یا (کانگریسی اُردو میں) "چُنے گئے"۔ لوٹ کر آئے بڑودہ سول سروس میں داخل ہوے ٹائمس آف انڈیا میں مضمون نگاری شروع کی، شہرت اور بڑھی۔ ۱۹۱۱ء آ گیا۔ کلکتہ سے کامریڈ نکالا۔ حاکموں اور محکوموں، انگریزوں اور ہندوستانیوں، سارے انگریزی دانوں کے حلقہ میں دھوم مچ گئی نثر میں شاعری! واہ واہ! اور سبحان اللہ! کے نعرے ہر طرف! ڈرائنگ روم میں بھی، اور کلب میں بھی شکسپیر کے فلاں ڈرامے پر مقید کیا خوب لکھدی! مسلم یونیورسٹی کے نظام زیر تجویز پر مضمون کیا زبردست لکھ ڈالا! ۱۹۱۲ء آیا۔ کامریڈ کو دہلی لائے۔ یہیں سے ہمدرد بھی نکالا۔ اب محمد علی ایڈیٹر سے کہیں بڑھ کر، صحیح معنی میں لیڈر تھے، اب قوم ان کی نہ تھی، وہ قوم کے تھے! جنگ طرابلس کے بعد جنگ بلقان چھڑی اور محمد علی، بے خودانہ اور مجنونانہ ادھر لپکے! بلقانی اتحادیوں کی ہر ضرب، ترکوں کے جسم پر نہیں، محمد علی کے قلب

پر پڑ رہی تھی! کچھ اور نہ بن پڑی تو ایک عظیم الشان اور یادگار زمانہ طبی وفد ہی ٹرکی روانہ کر دیا۔ چندہ کے لیے پکارا، تو روپیہ کا ڈھیر سامنے لگ گیا۔ اتنے میں مسجد کانپور کا ہنگامہ خونین پیش آ گیا، محمد علی دیوانہ وار جھٹ اس آگ میں بھی کود پڑے! ..... اب ان کا شمار ہوشیاروں میں، عاقلوں میں تھا کب؟ اب وہ مستوں کے مست تھے، ہاں مستِ الست!

ولایت گئے اور آئے، گرجے، چیخے، چلائے۔ دم لینے نہ پائے تھے کہ ۱۹۱۴ء کی محشر خیز جنگ یورپ شروع ہو گئی ...... خلافت اسلامیہ کی جنگ! آہ، کہ وہ آخری جنگ جس میں خلیفۂ اسلام کا پرچم لہرایا .... محمد علی اب اپنے عالم میں کہاں تھے! قلم کا ایک ایک لفظ تیر و نشتر، منہ کا ایک ایک بول سنان و خنجر! زبان کھولی، تو نظر بند ہوئے۔ نظر بندی بھی مہینے دو مہینے کی نہیں، اکھٹے پانچ برس کی! عمر ہی کتنی لے کر آئے تھے، اس میں بھی پانچ پانچ برس یوں زبان بندی، معطلی کی نظر، شاعری کے جوہر اسی زمانے میں چمکے۔ مظلوم کی زبان بن کر، نالہ و فریاد کرتے ہیں، ساتھ ہی تیکھی چتونوں سے ظالم کی طرف بھی گھورتے جاتے ہیں ؎

ہوں لاکھ نظر بند، دعا بند نہیں ہیں اللہ کے بندوں کو نہ اس طرح ستا دیکھ

جس کے دیوانے تھے، اس کے ہاں اپنے چاہنے والوں کے ساتھ قہر کہاں مہر ہی مہر، لیکن حقیقت مہر کبھی کبھی صورت قہر میں بھی جلوہ گر ہوتی ہے۔ اور پھر عاشقوں کے ساتھ تو ان کا معاملہ سب سے نرالا ہی رہتا ہے۔

امتحان پر امتحان سوز پر سوز، ابتلا پر ابتلا ؂

عشق معشوقان نہاں ست و ستیر　　عشق عاشق باد و صد طبل و نفیر!

محمد علی اس بھید کو پا گئے تھے۔ اس دیار کے راہ و رسم سے واقف ہو چلے تھے، سوچ سمجھ کر بولے ؂

یہ نظر بندی تو نکلی رد سحر　　دیدہ ہائے ہوش اب جا کر کھلے!

اور پھر اس سے بھی ترقی کر کے بولے کہ جو منزل مقصود پیش نظر ہے اُس کے لحاظ سے یہ قید و بند بھی کوئی امتحان ہے؟ اس کے لیے نقد جان کا مطالبہ ہونا تھا ؂

مستحق دار کو حکم نظر بندی ملا　　کیا کہوں کیسے رہائی ہوتے ہوتے رہ گئی

دوسروں کو سمجھاتے ہیں کہ بھائی اس میں رشک کی کیا بات ہے، حصہ بقدر جثہ، یہ اپنے اپنے ظرف کے اعتبار سے اپنی اپنی قسمت ہے ؂

ہے رشک کیوں یہ ہم کو سر دار دیکھ کر　　دیتے ہیں بادہ ظرف قدح خوار دیکھ کر

آپ فرمائیں گے "کیا خوب مصرعہ لگایا ہے" یہ خاکسار عرض کرے گا، کیا خوب اظہار حقیقت کر دیا ہے! اسی نظر بندی کے زمانے میں ایک بار ملاقات ہوئی، پوچھا رہائی کے بعد کیا ارادے ہیں؟ فرمایا "ارادے کیسے؟ اب دھن تو صرف ایک ہے" یورپ پہنچوں اور گلی گلی، گھر گھر تبلیغ اسلام کر دوں۔

نظر بندی اور اس کے بعد جیل! پانچ سال بعد چھوٹ کر آئے تو ملک میں تلاطم برپا، ترکوں پر جنگ کے بعد اب صلح کے وار توپ کے گولوں

کے بجائے اب صلح کانفرنس کے پیترے'! ادھر ہندوستان کے اندر، حکومت پنجاب کے بے پناہ مظالم کا طوفان! شروع ۱۹۲۰ء تھا، کہ محمد علی دو ایک رفیقوں کو ہمراہ لے' دَوڑے دوڑے پھر یورپ پہونچے' اور لندن اور پیرس کے خدا جانے کتنے جلسوں میں تقریریں کرڈالیں' وقت کی ضرورت ناگزیر، کہ موضوع صرف تحفظ خلافت ہی رہا، لیکن موقع جہاں کہیں بھی نکل سکا، چپکے چپکے اور اندر ہی اندر دین کی تبلیغ بھی؟

اذاں حرم میں کلیسا میں ترے ناقوس — کہاں کہاں ترا عاشق تجھے پکار آیا!

لوٹے تو پھر وہی جیل کا پھاٹک کھلا ہوا منتظر تھا "عدم تشدّد" پر لاکھ زور دیتے رہے لیکن حق گوئی کا جُرم بہرحال جرم ہی بنا۔ جامعہ ملیہ کی بنیاد علی گڑھ میں ڈال چکے تھے۔ اور ابھی چند ہی سبق پڑھائے ہوں گے کہ ۱۹۲۱ء کے آخر میں پکڑے گئے اور ۱۹۲۳ء تک' کچھ کم دو برس پھر چوروں اور رہزنوں' ڈاکوؤں اور قاتلوں کے ساتھ سرکار دولتمدار کے مہمان!...... اب سجدے زمین ہی پر ہوتے تھے لیکن سجدے والی زمین' رفعت میں آسمان سے مل مل کر رہتی تھی! اذرا آپ بیتی کی ایک دو حرفی روئداد تو کان لگا کر سُن ہی لیجئے ؎

معراج کی سی حاصل سجدہ میں ہے کیفیت
اک فاسق و فاجر میں اور ایسی کرامتیں

نکلے تو ہاتھوں ہاتھ لیے گئے' استقبال میں وہ بھی پیش پیش جن کے ہاں وطن' مذہب سے عزیز تر' دنیا' دین پر مقدم' کانگریس کے صدر

منتخب ہوئے، ملک نعروں سے گونج اٹھا، محمد علی کی زبان پر ایک ہی نعرہ، سب نعروں سے بالاتر، وہی نعرۂ تکبیر! .... وہی ساڑھے تیرہ سو برس کا پرانا! اللہ اکبر!

لڑکا کوئی نہ تھا، لڑکیاں چار تھیں، چاروں دل و جان سے بڑھ کر محبوب، جیل ہی میں تھے کہ منجھلی لڑکی جوان، بیاہی ہوئی، آمنہ دق میں مبتلا ہوئی، جو دوسروں کی اولاد کے لیے تڑپ جانے والا تھا، خود اپنی نازوں کی پالی لخت جگر کے لیے یہ خبر سُن کر کیسا کچھ بھڑ بھڑایا ہو گا دل پر کیا کچھ بیت کر رہی ہو گی! بیٹی سے عالم خیال میں کہتے تھے ؎

میں ہوں مجبور پر اللہ تو مجبور نہیں
تجھ سے میں دُور سہی وہ تو مگر دُور نہیں

دوادرمن کی انتہائی تدبیریں تو غریب، بے حوصلہ، والدین بھی کر ڈالتے ہیں، پھر وہ باپ جس کا دل حوصلوں اور ولولوں سے بھرا ہوا ہو، وہ شکل تک دیکھنے سے مجبور! ؎

امتحاں سخت سہی پر دل مومن ہی وہ کیا
جو ہر اک حال میں اُمید سے معمور نہیں
ہم کو تقدیرِ الٰہی سے نہ شکوہ نہ گلہ
اہلِ تسلیم و رضا کا تو یہ دستور نہیں

پھر اپنے، اور اپنی نورِ نظر، دونوں کے پیدا کرنے والے سے کچھ رو رو کر اور گڑگڑا، گڑگڑا کر عرض معروض کرنے لگ جاتے ہیں ؎

تو تو مُردوں کو جلا سکتا ہے قرآں میں کیا
تخرج الحیَّ من المیت مذکور نہیں؟
تیری قدرت سے خدایا تیری رحمت نہیں کم
آمنہ بھی جو شفا پائے تو کچھ دُور نہیں

اب اس کے بعد جو شعر ہے، اُس کے پڑھنے سے پہلے اولاد رکھنے والے

اپنا کلیجہ تھام لیں ؎

تیری صحت ہمیں مطلوب ہے لیکن اس کو نہیں منظور تو پھر ہم کو بھی منظور نہیں

اسّٰد اللہ جیل سے نکلے تو جسے گودوں میں کھلایا تھا، اُسے قبر میں بھی اُتارا!

سنہ ۱۹۲۴ء کا وسط تھا کہ خود ترکوں نے منصب خلافت کو توڑ کر رکھ دیا! نہ پوچھئے کہ محمد علی پر کیا گزر کر رہ گئی! خلافت اسلامیہ کا مٹنا، قیامت کا پیش خیمہ تو تھا ہی، خیر محمد علی کے حق میں خود قیامت بن کر رہی۔ معلوم ہوتا تھا آسمان سے بجلی گر پڑی۔ دل و جگر پس کر جھلس کر رہ گئے۔ وسط سنہ ۱۹۲۴ء سے آغاز سنہ ۱۹۳۱ء تک زندہ ضرور رہے۔ اور بہت سے زندوں سے کہیں بڑھ کر زندگی کا ثبوت دیتے رہے۔ سلطان ابن سعود کی حمایت میں اور پھر مخالفت میں خدا جانے کتنے اور کیسے کیسے عزیز دوستوں سے جھگڑے اور بچھڑے۔

سنہ ۱۹۲۸ء میں منجھلی لڑکی کی شادی کی، وہ سال ہی بھر بعد سنہ ۱۹۲۹ء میں اُسے بھی اپنے ہاتھوں دفنایا۔ کامریڈ نکالا۔ ہمدرد نکالا مگر دونوں کو بند کرنا پڑا۔ کانگریس والوں کی زیادتیوں کا مقابلہ بے جگری سے کیا یورپ اور قسطنطنیہ اور انگورہ بھی گئے آئے۔ یہ سب کچھ ہوا، اور اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہوتا رہا لیکن دل کی کلی جو الغاءِ خلافت سے مُرجھا چکی تھی، پھر نہ کھلنا تھی نہ کھلی۔ محمد علی اب زندہ تھے کب؟ یوں کہئے کہ زندگی کے جتنے دن لکھا لائے تھے، بس وہ پورے کر رہے تھے! ....

اب وہ انسان نہ تھے، صرف ایک چشم گریاں! صرف ایک قلب بریاں! صرف ایک آہ سوزاں۔

آخری سفر، دیکھنے میں لندن کا سفر گول میز کانفرنس کے لیے تھا، اور حقیقت میں سفر آخرت! بد بینوں نے کہا کہ اب اس خاکستر کے ڈھیر میں ہے کیا! لیکن جب بولنے کھڑے ہوے تو انگریز اور ہندی سب پکار اٹھے، کہ یہ گوشت پوست کا بنا ہوا آدمی ہے۔ یا ایک متحرک کوہ آتش فشاں! فاش و برملا کہا (جیسے مستقبل کو دیکھ ہی رہے ہیں) کہ "آزادی لینے آیا ہوں، یا تو آزادی لے کر جاؤں گا یا اپنی جان اسی سرزمین پر دے کر"۔ مالک نے بندے کی لاج رکھ لی۔ جنوری ۱۹۳۱ء کی پانچویں تاریخ اور شعبان ۱۳۵۰ھ کی پندرھویں شب میں عین اُس وقت جب رُوئے زمین کے مسلمان اپنے پروردگار سے رزق کی، صحت کی، اقبال کی، زندگی کی، مغفرت کی نعمتیں مانگ رہے تھے، مشیت الٰہی نے یہ نعمت عظمےٰ دنیائے اسلام سے واپس لے لی، .... شاید اس لیے کہ اُس کے ہم قوم اور ہم وطن اس کے اہل نہیں ثابت ہوے تھے! "آزادی" محمد علی کے ملک کو کیا ملتی، محمد علی کی رُوح کو البتہ مل گئی! بندہ اپنا ٹوٹا ہوا دل، ہزاروں داغ کھایا ہوا دل، لے کر اپنے مولیٰ کے حضور میں حاضر ہو گیا۔

موت لندن میں آئی اور دفن کے لیے جگہ کہاں ملی؟ سرزمین قدس میں قبلۂ اول، ہیکل سلیمانؑ کے قریب، جامع عمرؓ کے متصل! اقبال نے کہا، "ذرا دیکھنا محمد رسول اللہ کا غلام اور شیدائی، محمد علی،

جا کس راستے سے رہا ہے

سوئے گردوں رفت زاں راہے کہ پیغمبر گزشت!

اس موت پر! اس مدفن پر، رشک کس کو نہ آئے گا؟ پھر ماتم جس زور شور سے تنہا لکھنؤ یا کلکتہ یا بمبئی میں نہیں، سارے ہندوستان میں ہوا، سارے عالم اسلام میں ہوا، اس کی نظیر تاریخ اسلام میں آسانی سے تو نہ ملے گی۔ آخری اطلاعیں یہ ہیں کہ قدس شریف میں مقبرہ ایک زیارت گاہِ خلائق بن گیا ہے، زائروں کا ہجوم رہا کرتا ہے، مجاوروں کی اچھی خاصی آمدنی ہو جاتی ہے! خود کہہ بھی تو گئے تھے سہ

ہے رشک ایک خلق کو جوہر کی موت پر
یہ اس کی دین ہے جسے پروردگار دے

سیّد سلیمان ندوی

مولانا سید سلیمان صاحب ندوی اُردو کے بلند پایہ ادیب ہیں۔ آپ کا وطن صوبہ بہار ہے لیکن عمر کا بیشتر حصہ اعظم گڈھ (یو۔پی) میں گذرا۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں تعلیم حاصل کی۔ عربی زبان اور ادب میں آپ کو مہارت حاصل ہے۔ اسلامی تاریخ کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ طالب علمی کے زمانے سے اُردو مضمون نگاری کا شوق تھا۔

آپ مولانا شبلی مرحوم کے شاگرد رشید ہیں۔ آپ نے مولانا موصوف کی وفات پر ان کی وصیت کے مطابق "دار المصنفین" کو جاری رکھا اور "سیرت النبی" کی تکمیل کی۔ عربی و فارسی کے جید عالم اور اُردو کے مسلم الثبوت انشا پرداز ہیں۔

آپ کے انداز تحریر میں وہی پختگی ترتیب خیالات عالمانہ متانت اور زور بیان جو شبلی مرحوم کے اسلوب تحریر کی خصوصیت تھی پائی جاتی ہے۔

آپ اپنی عبارت میں باوجود عربی و فارسی کے عالم ہونے کے کبھی ان زبانوں کے نامانوس الفاظ استعمال نہیں کرتے۔

آپ اچھے مقرر ہیں۔ کبھی کبھی آپ کی تحریر میں لطف تقریر کا مزہ آتا ہے جس سے زور بیان اور بڑھ جاتا ہے۔ آپ بہت سی مفید کتابوں کے مصنف ہیں۔

اُردو کیونکر پیدا ہوئی؟

زبان اُردو کی تاریخ کے متعلق میر امن اور سر سید اور دوسرے پُرانے بزرگوں نے جو بیان سُنایا تھا وہ اب پارینہ سمجھا جاتا ہے، اور اب اس مضمون پر چند ایسی محققانہ کتابیں لکھی گئی ہیں، جن سے اس زبان کی تاریخ کا دشوار گزار راستہ بہت کچھ صاف ہو گیا ہے، اور اب اس کے وجود کا سراغ بہت دُور تک لگایا جا چکا ہے، اور آج سے پانچ سو برس پہلے کے فقرے جمع کیے گئے ہیں، اور تیموری بادشاہوں سے بہت پہلے کی نظم و نثر کی کتابیں مہیا کی گئی ہیں، اور اب چہار درویش کے مصنف میر امن کے اس بیان کو لوگ صرف بزرگوں کی کہانی سمجھتے ہیں۔

"حقیقت اُردو زبان کی بزرگوں کی زبان سے یوں سنی ہے کہ دلّی شہر ہندوؤں کے نزدیک چوجگی ہے، انہی کے راجا پرجا قدیم سے وہاں رہتے تھے اور اپنی بھاکا بولتے تھے ہزار برس سے مسلمانوں کا عمل ہوا، سلطان محمود غزنوی آیا، پھر غوری، اور لودی بادشاہ ہوئے۔ اس آمد و رفت کے باعث کچھ زبانوں نے ہندو مسلمان کی آمیزش پائی، آخر امیر تیمور نے جن کے گھرانے میں اب تلک نام نہاد سلطنت کا چلا جاتا ہے، ہندوستان کو لیا۔ ان کے آنے اور رہنے سے لشکر کا بازار شہر میں داخل ہوا اس واسطے شہر کا بازار

اُردو کہلایا...... جب اکبر بادشاہ تخت پر بیٹھے تب چاروں
طرف کے ملکوں سے سب قوم قدردانی اور فیض رسانی اس
خاندان لاثانی کی سُن کر حضور میں آکر جمع ہوئے۔ لیکن
ہر ایک کی گویائی اور بولی جُدی جُدی تھی، اکٹھے ہونے
سے آپس میں لین دین، سودا سلف، سوال جواب کرتے
ایک زبان مقرر ہوئی۔"

جب حضرت شاہجہاں صاحبقران نے قلعۂ مُبارک اور جامع مسجد
اور شہر پناہ تعمیر کرائی...... تب سے شاہجہاں آباد مشہور ہوا،
(اگرچہ دلّی جدی ہے اور وہ پُرانا شہر اور یہ نیا شہر کہلاتا ہے، اور
وہاں کے بازار کو اُردوئے معلّیٰ کا خطاب دیا)۔

اِن چند سطروں میں اُردو کی جو تاریخ بیان کی گئی ہے، وہ
زمانہ اور اشخاص کے ناموں کو چھوڑ کر سرتاپا حقیقت ہے یعنی یہ کہ
موجودہ معیاری اُردو دہلوی زبان اور دوسری زبانوں سے مل کر بنی ہے
آج کل بعض فاضلوں نے "پنجاب میں اُردو" اور بعض اہلِ دکن نے
"دکن میں اُردو" اور بعض عزیزوں نے "گجرات میں اُردو" کا نعرہ
بلند کیا ہے، لیکن حقیقت یہ معلوم ہوتی ہے کہ ہر ممتاز صوبے کی مقامی
بولی میں مسلمانوں کی آمد و رفت اور میل جول سے جو تغیرات ہوئے،
اُن سب کا نام "اُردو" رکھ دیا گیا ہے، حالانکہ اِن کا نام پنجابی، دکھنی
یا گجراتی اور گوجری وغیرہ رکھنا چاہیے، جیسا کہ اس کے عہد کے لوگوں نے

کہا ہے، یہ تغیرات جب ممتاز صوبوں میں ہو رہے تھے تو خود پایۂ تخت دہلی میں تو اور زیادہ ہوئے۔

امیر خسرو اور ابو الفضل دونوں نے "دہلوی زبان" کا الگ نام لیا ہے، عہد شاہجہانی میں جب یہاں اُردوئے معلّیٰ بنا، تو اُس "زبانِ دہلی" کا نام "زبان اُردوئے معلّیٰ" پڑ گیا، چنانچہ لفظ اُردو زبان کے معنی میں دہلی کے علاوہ کسی صوبے کی زبان پر اطلاق نہیں پایا ہے، میر تقی میر کی تحریری سند میں جب اس کا نام پہلی دفعہ آیا ہے تو اصطلاح کے طور پر نہیں، بلکہ لغت کے طور پر آیا ہے، یعنی میر نے "اُردو زبان" نہیں کہا، بلکہ "اُردو کی زبان" کہا ہے۔

"ریختہ۔ شعرے ست بطور شعر فارسی بزبان اُردوئے معلّیٰ بادشاہ ہندوستان" ذکر میر ۴۳ بادشاہِ ہندوستان کے کیمپ یا پایۂ تخت کی زبان۔"

اس کے بعد عام استعمال میں زبانِ اُردو کے بجائے خود زبان کا نام اُردو پڑ گیا اور پھر یہ اُردوئے معلّیٰ سے نکل کر ملک میں ہر جگہ اسی اصول پر پھیل گئی، جس اصول پر ہندوستان میں ہمیشہ راجدھانی کی بھاکا تمام حدودِ سلطنت میں پھیلتی رہی ہے۔

اس زبان کی اصلیت کیا ہے؟ ہم نے پچھلی سطروں میں اس کو بار بار "نئی زبان" کہا ہے، مگر کیا حقیقت میں اس کو نئی زبان کہنا چاہیے ہم جس کو آج زبان اُردوئے معلّیٰ کہتے ہیں حقیقت میں وہ دہلی اور

اطراف دہلی کی وہ پرانی بولی ہے جو وہاں پہلے سے بولی جارہی تھی، اور اور جس میں زمانے کے قاعدے کے مطابق انقلاب، اتار چڑھاؤ اور خراد ہو ہو کر لفظوں کی مناسب صورت بن گئی۔

ہر زبان تین قسم کے لفظوں سے بنتی ہے۔ اسم، فعل اور حرف، اس بولی میں جس کو اب اردو کہنے لگے ہیں، فعل جتنے ہیں وہ دہلوی ہندی کے ہیں، حرف جتنے ہیں ایک، دو کو چھوڑ کر وہ ہندی کے ہیں، البتہ اسم میں آدھے اس ہندی کے اور آدھے عربی، فارسی اور ترکی کے لفظ ہیں، اور بعد کو کچھ پرتگالی اور فرنگی کے وہ لفظ مل گئے ہیں، جن کے مسمّیٰ ان باہر کے ملکوں سے ہیں، جیسے نیلام، پاؤ (روٹی)، پادری، الماری وغیرہ۔

اس لیے اردو اور ہندی (وہ بھی دہلوی ہندی) میں صرف دو فرق ہیں دہلوی ہندی تو اپنی جگہ پر رہ گئی، لیکن اسی ہندی میں اس وقت کے نئے ضروریات کے بہت سے عربی، فارسی اور ترکی کے وہ الفاظ آکر ملے، جن کے معنی اور مسمّیٰ اِن ملکوں سے آئے تھے۔ دوسرا فرق یہ پیدا ہوا کہ وہ ہندی اپنے خط میں اور یہ اردو فارسی خط میں لکھی جانے لگی۔

رفتہ رفتہ ایک اور بھی فرق پیدا ہوا کہ پُرانی ہندی کے بہت سے لفظ جو زبان پر بھاری اور ثقیل تھے زمانہ اور زبان کی فطری ترقی کے اصول کے مطابق ان میں ہلکا پن، خوبصورتی، اور خوش آوازی پیدا کرنے کی کوشش کی گئی، اِسی طرح عربی اور فارسی اور ترکی کے لفظوں میں بھی اپنی طبیعت کے مطابق اس نے تبدیلیاں پیدا کیں۔

اردو نے ہندی کے لفظوں میں اس قسم کا جو تغیر کیا ہے اس کی چند مثالیں یہ ہیں :-

ہندی	اردو	ہندی	اردو
گنڑ	گن	جیو	جی
براہمنڑ	برہمن	شکتی	سکت
راونڑ	راوان	رکھنا	رکھ
ودا	بیاہ	پونچا	پہنچا
جیشٹھ	جیٹھ	کنتو	کیونکہ
ورش	برس (سال)	مائی	ماں
پرنتو	پر (مگر)	سمے	سماں
ادچت	اچھا	دیش	دیس
سمبندی	سمدھی	لکھشن	لچھمن
ویشاکھ	بیساکھ	ناش	ناس (خراب)
ویچار	بچار	اگنی	آگ
کھشتری	کھتری	پورن	پورا
منش	مانس (جیسے بھلا مانس)	مورتی	مورت
میگھ	مینھ	ست یا سانچ	سچ
ورشا رت	برسات	کٹمب	کنبہ (خاندان)
وارتا	بات	اٹ	آٹا

ہندی	اردو	ہندی	اردو
ہستی	ہاتھی	پانیں	پانی
بادر	بادل	دوہے	دہی
دُدّھ	دودھ یا دود	گِھرت	گھی
نا	نہ	بھن بھن	بھانت بھانت

اب چونکہ پورا ملک ایک تھا اور ہمیشہ آمد و رفت لگی رہتی تھی، اس لیے اس دہلوی ہندی میں سیکڑوں لفظ ہندوستان کے دوسرے صوبوں کی بولیوں نے آکر رفتہ رفتہ رل مِل گئے، خصوصاً پنجابی اور دکھنی لفظوں کی آمیزش زیادہ ہوئی۔

کہیں یہ ہوا ہے کہ فارسی اور ہندی دونوں کے ہم معنی لفظوں کو ایک جگہ کرکے بولنا شروع کیا، تاکہ دونوں زبانوں کے الگ الگ جاننے والے، ایک لفظ سے دوسرے لفظ کے معنی کو سمجھ لیں، جیسے دھن، دولت، رنگ روپ، ننگ ڈھنگ، خاک دھول، کاغذ پتر، موٹا تازہ، ہنسی مذاق، ہنسی خوشی، بھائی برادری، رشتہ ناتا، داغ دھبا، دکھ درد، صاف ستھرا، زیت رسم، کبھی فارسی لفظ میں ذرا ہندی پن پیدا کر دیتے ہیں، جیسے جن، مجور یا مزدور یعنی مزدور، لونڈی باندی (بندی، بندہ بمعنی غلام)

ان دونوں کو دو زبانوں کی جگہ ایک بھاشا بنانے کے لیے یہ چاہیے کہ ان دونوں کے لکھنے والے اپنی اپنی جگہ پر چند ایسے اصول ایک ساتھ بنالیں جن کو دونوں نباہ لے جائیں۔

رشید احمد صدیقی

قصبہ مڈہاہو ضلع جونپور کے رہنے والے ہیں۔ آپ ۱۸۹۵ء میں وہیں پیدا ہوئے۔ آجکل علیگڈھ یونیورسٹی میں شعبۂ اُردو کے صدر ہیں آپ کا زیادہ وقت درس و تدریس اور دیگر ادبی کارناموں کے علمی مشغلوں میں صرف ہوتا ہے۔ آپ نہایت سنجیدہ مزاج۔ زندہ دل اور شگفتہ طبیعت کے بزرگ ہیں۔ آپ کی تحریروں میں سنجیدگی اور متانت و ظرافت نے مل کر ایک عجیب ادبی شان پیدا کردی ہے۔

رشید صاحب کے مضامین میں ظرافت کے ساتھ ساتھ ایک زبردست طنز بھی پایا جاتا ہے۔ ادبی سیاسی اور اخلاقی مضامین میں رشید صاحب نے ایسے پرکار طنزیہ نکات پیدا کیے ہیں کہ گویا سنجیدہ طنز نگاری آپ ہی کا حصّہ ہوگئی ہے۔ مزاحیہ نگاری اور طنز نویسی میں آپ کا شمار ممتاز ترین انشا پردازوں کی صفِ اوّل میں ہوتا ہے۔

آپ بہت بلند پایہ نقاد بھی ہیں آپ کی نقادانہ کاوشیں قابل تعریف ہیں "مضامینِ رشید" اور "خنداں" مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہیں۔ "گنج ہائے گراں مایہ" ان کے سوانحی مرقع ہیں "طنزیات اور مضحکات" میں آپ نے مزاح نگاری کی تاریخ لکھی ہے۔

کانفرنس، کونسل، کمیٹیاں

میرے ایک بڑے محترم لیکن چلبلے بزرگ تھے۔ جن کی عادت تھی
کہ وہ جب تک دن میں بے شمار جھوٹ نہیں بول لیتے تھے یا اتنی ہی
میٹنگ نہیں کر لیتے تھے اس وقت تک نہ خود چین سے بیٹھتے تھے اور
نہ دوسروں کو چین سے بیٹھنے دیتے تھے۔ جھوٹ بولنا چاہتے تھے تو
میٹنگ کرتے تھے اور میٹنگ کرنا چاہتے تھے تو جھوٹ بولتے تھے۔
کمیٹیاں بنانے اور بات بگاڑنے کا بڑا ذوق رکھتے تھے۔ اُٹھنا بیٹھنا
کھانا پینا، بات چیت، ہار جیت، مار پیٹ، ہجر وصال، شادی و غمی،
دنیا و عقبیٰ سب کچھ میٹنگ کے ذریعے عمل میں آتا۔ عقل و ایمان
سے زیادہ میٹنگ پر بھروسا کرتے۔ سوچتے کچھ تھے، لکھتے کچھ تھے۔
پڑھتے کچھ تھے، فیصلہ کچھ ہوتا، کرتے کچھ تھے۔ اکبر مرحوم آپ کو
یاد ہوں گے اور غالباً ان کا یہ شعر بھی ؎

کمیٹی میں چندہ دیا کیجئے ترقی کے ہجے کیا کیجئے

اکبر کا نسبتہً فارغ البالی کا زمانہ تھا۔ ہمارے ان بزرگ نے
وہ زمانہ پایا تھا جب روپے پیسے کے اعتبار سے تحت اللفظ ہو چکے
تھے۔ اس لیے موصوف نے اس شعر میں ترمیم کر دی تھی۔

کمیٹی میں شرکت دیا کیجئے ترقی کے ہجے کیا کیجئے

جہاں تک میرا تجربہ ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ آپ کو نہ ہو کہ جب

کسی کو ٹالنا یا نہ کرنا مقصود ہوتا ہے تو وہ کسی کمیٹی کے سپرد کر دیا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ جب یہ منظور ہوتا ہے کہ اس کام کو اس قابل نہ رکھا جائے کہ کوئی دوسرا اسے پورا کر سکے تو اس کی مٹی کسی کانفرنس میں پلید کرائی جاتی ہے۔ کمیٹی، کونسل، کمیشن، جوبلی ڈے وغیرہ ایک ہی مرض کی مختلف دلچسپ علامتیں ہیں۔

پرانے زمانے میں جب ریڈیو کا دور دورہ نہ تھا اس وقت امراض دور کرنے، مقدمہ جیتنے، روزی کمانے، اولاد پیدا کرنے، مینہ برسانے، محبوب کو قابو میں لانے اور رقیب کو واصل جہنم کرنے کے لیے، ڈونے، ڈھکلے سے کام لیا جاتا تھا۔ اب اس قسم کے کاموں کے لیے کونسل اور کمیٹیاں بنائی جاتی ہیں۔ عدالتیں کھول دی گئی ہیں۔ رزولیوشن پاس کیے جاتے ہیں، جیل خانے کے دروازے کھٹکھٹائے جاتے ہیں، شریفوں کی پگڑیاں اچھالی جاتی ہیں اور ریڈیو پر تقریر کی جاتی ہے۔

آپ نہیں تو آپ کے بزرگوار نے (اور اس سے نہ آپ کی تحسین مقصود ہے اور نہ آپ کے بزرگوں کی توہین) وہ زمانہ یقیناً دیکھا ہوگا جب بارش نہ ہونے پر دیہات کے لڑکے ننگ دھڑنگ، محض ایک لنگوٹی زیب ستر کیے دروازے، دروازے اچکتے کودتے شور مچاتے کیچڑ پانی میں لوٹتے چیختے چلاتے تھے۔

"کال کلوٹی اجر دھوتی۔ کالے میگھا پانی دے۔"

وہ باتیں اب خواب وخیال ہو چکی ہیں۔ ان کی جگہ اب جلسوں، جلوسوں، زندہ باد کے نعروں اور بہت سی باتوں نے لے لی ہے جن کا تذکرہ یوں نہیں کرتا کہ

دوریم از سواد وطن باز چوں رسیم!

عام طور پر کسی ملک یا قوم یا ادارے کی ترقی کا اندازہ اس کی کمیٹیوں، کونسل اور کانفرنس سے کرتے ہیں۔ لوگ ان کے مہمل ہونے کے قائل بھی ہیں لیکن مشکل یہ آن پڑی ہے کہ کمیٹی اور کانفرنس کی ممبری قوم اور ملک کے لیے مفید ہو یا نہ ہو خود ممبروں کے لیے نہایت نفع بخش ہوتی ہے۔ آپ کے کسی کمیٹی کے ممبر ہو جانے کی دیر ہے، آپ کے لڑکے بغیر کسی فیس کے تعلیم حاصل کریں گے۔ ہسپتال والے آپ کا مفت علاج کریں گے۔ سفر بلا ٹکٹ کر سکیں گے۔ نان، نفقہ، بھنگی، بھشتی، نائی، دھوبی، درزی، موچی، گرہ کٹ، کوکین فروش، کن میلئے، گورکن، کفن چور، پٹواری، اڈیٹر، مسخرے سب کی مفت خدمات آپ کے لیے وقف ہوں گی۔ آپ کو سوا اپنی تجہیز وتکفین کے اخراجات کے کسی اور مد میں مالی زیر باری نہ ہوگی بشرطیکہ مرد آخرت بیں کی حیثیت سے آپ نے اس کا انتظام بھی اپنی زندگی ہی میں نہ کر لیا ہو ——————

—— چنانچہ یہ امر مسلم ہے کہ جو حرکتیں کسی فرد کے لیے جیل خانے جانے کا موجب بن سکتی ہیں وہی باتیں کمیٹی یا کونسل کے ممبروں

کے لیے ہر دلعزیز اور ذی اثر ہونے کا ثبوت بہم پہونچاتی ہیں۔

کمیٹی کانفرنس اور اس قسم کے دوسرے اداروں کو جمہوری نظام کی پیداوار سمجھا جاتا ہے، کیونکہ جمہوری نظام اس وقت تک جمہوری نظام کیونکر کہا جا سکتا ہے جب تک اس قوم کی روایات یا میلانات جمہوری نہ ہوں جس نے اس نظام کو اختیار کیا ہو۔ ہمارے ملک میں کمیٹیوں یا کونسلوں کی کمی نہیں ہے اور ضابطے کی رو سے آپ ان پر اعتراض بھی نہیں کر سکتے لیکن یہ کمیٹیاں اور کونسلیں کن افراد پر مشتمل ہوتی ہیں اور ان افراد کی افتادِ ذہنی کیا ہوتی ہے، یہ بھی اپنی جگہ پر جانی بوجھی ہوئی چیزیں ہیں۔ سب سے زیادہ تکلیف دہ وہ باتیں ہوتی ہیں جو جمہوری نظام کی آڑ میں شخصی جبروت یا جماعتی تنگ نظری کی ترجمان ہوں۔

لیکن اس قسم کی باتیں ہم آپ برابر دیکھتے سنتے آئے ہیں اور ریڈیو پر وہی باتیں دوہرائی جو اخبارات میں لکھی ہوں، لیڈروں کا تکیہ کلام ہوں یا یکّہ والوں کی زبان پر ہوں ریڈیو پر تقریر کرنے والوں کی بدنیتی اور بد مذاقی کا ثبوت ہے۔ اسی کو بدمعاملگی بھی کہتے ہیں۔ میں بدمعاملگی کے بجائے نمک حرامی کا لفظ استعمال کرنا چاہتا تھا لیکن اس خیال سے رک گیا کہ نمک حرامی کی فہرست یونہی کیا کم طویل ہے کہ اس کو براڈکاسٹ بھی کیا جائے۔

بہر حال اس قسم کی باتیں ریڈیو پر تقریر کرنے والوں سے سرزد ہوتی ہوں یا نہیں، ریڈیو سٹ کا لائسنس نہ رکھنے والوں سے غالباً ضرور سرزد ہوتی ہوں گی۔ غالباً کا لفظ میں نے احتیاطاً استعمال کیا ہے۔ اس سے آپ میرے غور و خوض کا اندازہ لگا سکتے ہیں اور میری احتیاط کا بھی۔ میری طرح آپ بھی عدالتوں یا بڑے آدمیوں سے ڈرتے ہوں تو غالباً، وغیرہ، ممکن، اور اسی طرح کے بعض دوسرے احتیاطی الفاظ اور فقروں کا ورد رکھا کیجئے۔ بعض الفاظ میں بھک سے اڑ جانے والے مادّے کی خاصیت ہوتی ہے۔ ان کے لیے یہ الفاظ پانی کے چھینٹے کا کام دیتے ہیں۔

میں نے ابتدا میں عرض کیا تھا کہ جس بات کو عام طور پر نہیں کرنا مقصود ہوتا ہے اسے کسی کمیٹی کے سپرد کر دیجئے وہ کام بہ تیقن ہو جائے گا۔ کوئی بات یقینی ہو لیکن آپ اسے مشتبہ بنانا چاہتے ہوں تو کمیٹی یہ کام بھی انجام دے گی۔ آپ کسی شخص کو مجرم قرار دینا چاہتے ہوں اور کوئی سبیل اس کے مجرم قرار دینے کی نظر نہ آتی ہو تو یہ فرض کسی کمیٹی کے سپرد کر دیجئے۔ کمیٹی اس کے اسلاف اور اولاد تک کو مجرم ثابت کر دے گی۔ کمیٹی اور کونسل صلح کے زمانے میں وہی کرتی ہیں جو اسلحہ اور بارود جنگ کے زمانے میں کرتے ہیں۔

عدالتوں میں جو چیز فردِ جرم کہلاتی ہے وہی کمیٹی یا کانفرنس میں ٹرم آف ریفرنس ہوتی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ عدالت میں

صفائی دینے سے آپ کے بے گناہ ثابت ہونے کا امکان ہے اور آپ بری بھی کیے جا سکتے ہیں۔ کمیٹی یا کمیشن کی زد میں آپ کا جان بچ ہو جانا مسلّم ہے۔

مثلاً کمیٹی کونسل یا میٹنگ کی کارستانیاں ملاحظہ فرمائیے:۔
فرض کیجئے مسئلہ زیر بحث یہ ہے کہ ہندوستان کا چقندر خطرے میں ہے سب سے پہلے یہ خبر اخبار میں شائع کی جائے گی۔ نہایت جلی اور شعلہ ناک سرخیوں کے ساتھ، دوسرے دن تار آنے شروع ہو جائیں گے کہ مسئلہ چقندر پر غور کرنے کے لیے فلاں فلاں مقامات پر جلسے ہوئے جس میں "چقندر زندہ باد" کے نعرے لگائے گئے اور باتفاق آرا یہ تجویز پاس کی گئی کہ ہندوستانی چقندر کے ساتھ بڑی ناانصافی برتی جا رہی ہے اور اس کے مقابلے میں غیر ملکی چقندر کو جو رعایتیں حاصل اور جو سہولتیں فراہم کی جا رہی ہیں اس سے تمام ملک کے چقندر بیزار ہیں۔ اگر حکومت نے چقندر کے تحفظ میں مناسب کاروائی اختیار نہیں کی تو سارے ملک میں بدامنی پھیل جائے گی۔

چنانچہ تجویز پاس کی گئی کہ تمام ملک میں "یوم چقندر" منایا جائے "چقندر" کا جلوس نکالا جائے۔ لوگوں کو چاہیے کہ اس دن وہ صرف چقندر کھائیں۔ جن کو میسر نہ آئے وہ چقندر کی صورت بنائیں۔ عورتیں بطور فیشن اور بچے بطور کھلونا استعمال کریں چقندر ریلیف فنڈ کھولا جائے۔ لیڈروں کو اس کے ہار پہنائے جائیں۔ اطبّا نسخوں میں

لکھیں۔ شعرار بطور قافیہ استعمال کریں۔ گویّے اس پر تان توڑیں روشن خیال بطور آرٹ، طلبا بطور اسٹرائک۔ وکلار بشکل نظائر، پولیس بطور چقندر چارج، مصنفین بطور اُردو، ہندی یا ہندوستانی استعمال کریں اور ہر شخص اس بات کا عہد کرے کہ جب تک وہ چقندر کو آزاد نہ کرالے گا کوئی ایسا کام نہ کرے گا جو روایات چقندری کے خلاف ہو۔

اس کے بعد ہی کونسل میں یہ سوال پیش ہو گا، کیا حکومت اس عام بے چینی اور ہل چل سے واقف ہے جو چقندر کی حمایت میں راس کماری سے کشمیر اور سندھ سے آسام تک پھیل چکی ہے؟ جواب اثبات میں ہو یا نفی میں، قوم کو اپنے جذبات چقندری سے عہدہ برآ ہونے کے لیے کونسل کا اجلاس ملتوی کیا جائے۔ اب جن بزرگوں کے پورٹ فولیو میں چقندر ہو گا وہ فرمائیں گے، حکومت اس مسئلہ پر غور کر رہی ہے کہ کچھ سرکاری کچھ غیر سرکاری اراکین کا ایک چقندر کمیشن مقرر کر دیا جائے جو پوری تحقیقات کے بعد اپنی رپورٹ اس کونسل میں پیش کرے۔

چقندر کمیشن کے اراکین کی نامزدگی کا مسئلہ بعض نوعیتوں سے بڑا دلچسپ ہے۔ سب سے پہلے یہ دیکھا جاتا ہے کہ کون کون سے ممبر ایسے ہیں جنھیں کسی اور سیب گوبھی، گاجر کمیٹی یا کمیشن میں جگہ نہیں ملی ہے، ان کے کھپانے کا یہ بہترین موقع ہے۔ کونسل میں اس قسم کے

داغ متبخن یا دال دلیا کا انتظام نہ ہو تو قسم قسم کے ممبروں سے عہدہ برآ ہونا حکومت کے لیے مشکل ہو جائے۔ اب کمیشن کے اراکین ان مقامات کا دورہ کریں گے جہاں چقندر کا کاروبار ہوتا ہے۔ چقندر کے اعداد فراہم کیے جائیں گے۔ چقندر خوروں کا، چقندر خوروں کی عمر، تعداد نمایندگی، تعلیم، آمدنی و خرچ، حرکات و سکنات، توالد و تناسل کا جائزہ لیا جائے گا۔ غیر ملکی ماہرین چقندر کی خدمات حاصل کی جائیں گی۔ ہر ممبر اپنے سفر خرچ کا حساب لگائے گا اور بالآخر اس چقندر گردی کو گرمی کے زمانہ میں کسی پہاڑ پر ختم کر دیا جائے گا جہاں اس کی رپورٹ تیار کی جائے گی۔

اس رپورٹ کے شائع ہوتے ہی تمام ملک میں نئے سرے انتشار و ہیجان برپا ہوگا جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ایک گول میز کانفرنس قایم ہوگی۔ اس میں شریک کیے جانے کے لیے لوگ دوڑ دھوپ شروع کر دیں گے۔ کچھ لوگ چقندر کی حمایت میں بھلے مانسوں کی عزت و عافیت کے درپے ہوں گے۔ کچھ عوام کو ایمان و دھرم کا واسطہ دلا کر اپنا جلوس نکلوائیں گے۔ کچھ مسجد کے سامنے باجا بجائیں گے۔ کچھ ارتھی پر ڈھیلے پھینکیں گے۔ کچھ خطبۂ صدارت تصنیف فرمائیں گے۔ کچھ فاقہ کریں گے۔ کچھ تار بھیجیں گے، کچھ انٹرویو دیں گے۔ بقیہ پڑنا مچائیں گے، اسٹرائک کریں گے، جیل خانے جائیں گے۔ ایک آدھ مر بھی جائے گا۔ انجام یہ ہوگا کہ ان میں سے

بعض گول میز کانفرنس کے ممبر بنائے جائیں گے اور بقیہ سنکھیا کھانے یا سرکاری گواہ بننے کی فکر کریں گے۔

دنیا میں جب تعلیم اور بے روزگاری عام ہوتی ہے تو آمدنی کے عجیب وغریب ذرائع بھی نکل آتے ہیں، بے روزگاری سے میری مراد معاش میسر آنا ہی نہیں بلکہ اکثر معقول مشغلے کا میسر نہ آنا بھی ہے۔ کسی زمانے میں ہمارے یہاں کھانے پینے کی کمی نہ تھی لوگ پتنگ اُڑاتے تھے، بٹیر لڑاتے تھے اور دوائیں کھاتے تھے۔ اب افواہیں اڑاتے ہیں قومیں لڑاتے ہیں دعوتیں کھاتے ہیں پہلے معیشت تھی، مشغلے نہ تھے۔ اب مشغلے ہیں معیشت نہیں ہے۔ پہلے رؤسا تھے جن کے مصاحب ہوتے تھے، ارباب نشاط تھے اور پکے گانے تھے۔ اب لیڈر ہیں جن کے مصاحب اور ارباب نشاط بھی ہیں "توضیح سے ڈرتا اور آپ سے معافی مانگتا ہوں" پکے گانے کے بجائے قومی نعرے اور خطبۂ صدارت ہیں جن میں کہیں غزل کا لوچ، قصیدے کا زور، رجز کا آہنگ، مثنوی کی روانی اور مرثیے کا سوز وگداز ہے تو کہیں تعصب کی بساند، مشیخت کی بکواس اور حسد کی سڑاند ہے پہلے جو کچھ درباروں اور حرم سراؤں میں ہوتا تھا، اب کمیٹیوں اور کانفرنسوں میں ہوتا ہے، پہلے جو نصیب دشمناں تھا اب سر دوستاں ہے۔

کمیٹیاں اور کانفرنس بجائے خود معقول چیزیں ہیں لیکن

معقول ہی چیزیں جب نامعقول سے وسیلہ بن جاتی ہیں تو شرفار کو پگڑی سنبھالنے، اور بھیک مانگنے کے سوا چارہ نہیں رہتا۔ جمہوری نظام، جس کے یہ کمیٹی کونسل کھلونے ہیں سب سے بڑی بدنصیبی یہ ہے کہ اس میں نامعقول سے نامعقول بات کو بھی فروغ دینے کا امکان بڑھ جاتا ہے لیکن یہاں میں جمہوری اور غیر جمہوری نظام کی بحث میں نہیں پڑنا چاہتا۔ اس قسم کی بحثیں یا تو اسکول کالج کے طلبار کرتے ہیں، مثلاً فلاں شخص نے یہ کہا ہے، فلاں کتاب میں یہ لکھا ہے، میں یہ کہتا ہوں وغیرہ، آپ مانتے ہیں تو آپ کی خوش نصیبی ورنہ "زمین کسان کی آسمان نوجوان کا کمان انسان کی۔ تیر شیطان کا اور گردن آپ کی" لیڈروں کا کیا پوچھنا ان کو ہار پہنائیے۔ نعرے لگائیے۔ ووٹ دیجئے اور جو جی چاہے کہلوا لیجئے۔ یہاں سب سے انوکھی بحث کرنی ہے یعنی بات ایسی ہو جو گنوار، تعلیم یافتہ، بچے، نوجوان، بوڑھے، خواتین حاکم و محکوم سب کے لیے یکساں مفید اور دلچسپ ہو۔ کمیٹی کے اراکین اور ریڈیو کے سامعین دونوں کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ کون اور کس قسم کے لوگ ہوں۔ فرض کیجئے میں تو گنوار کو سمجھا رہا ہوں نوجوان یہ سمجھیں کہ ان کی توہین ہو رہی ہے۔ خواتین کی طرف متوجہ ہوں تو بوڑھے بگڑ کھڑے ہوں، بوڑھوں کے دامن میں پناہ لینے کی کوشش کروں تو بچے تالیاں بجانے لگیں،

نوجوان سے مخاطب ہوں تو بگڑی فریاد کرنے لگے۔ محکوم سے بولوں تو حاکم گرفتار کرے اور حاکم سے گفتگو کیجئے تو "نورٌ علیٰ نور" نہ گھر کا نہ گھاٹ کا۔

کمیٹی اور کانفرنس کا مضحکہ میں نے ضرور اڑایا ہے لیکن میں ان لوگوں میں نہیں ہوں جو شراب کے عیب بیان کرنے میں اس کے ہنر نظر انداز کر جاتے ہیں۔ میں تو اکثر مواقع پر ہنر بیان کرتا ہوں اور عیب سے درگزر کرتا ہوں تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ان میں ایک موقع شراب کا بھی ہوتا ہے اور یہ میں اس لیے کہہ دیتا ہوں کہ شراب کی دوکان بڑھ چکی ہے لیکن تہمت شراب اب بھی باقی ہے۔

اس میں شک نہیں، کونسل اور کمیٹیوں میں بعض بڑی خوبیاں بھی ہیں بشرطیکہ جو بات طے پائے وہ کمیٹی اور کونسل کا بے لاگ فیصلہ ہو۔ نہ یہ کہ فیصلہ پہلے ہو چکا ہو، گواہی جرح اور بحث بعد میں ہو۔ عام طور پر دیکھا یہی جاتا ہے کہ جو مقصد کسی خاص شخص یا جماعت کے مدِ نظر ہوتا ہے وہی بالآخر کمیٹی یا کمیشن کا فیصلہ ہوتا ہے یعنی عقلمند فیصلہ کرتا ہے۔ اس کا اعلان بے وقوفوں سے کراتا ہے میں سیاسیات یا قومیات کا نہ معلم ہوں نہ مداری لیکن سیاسی اور قومی بازی گری کے تماشے دیکھتا رہتا ہوں۔ نت نئے تماشے۔ ہم سب سیاسی اور قومی حقوق و اختیارات کو پہچانتے تو

خوب ہیں لیکن ان کا سزاوار بننے کے لیے جس محنت خلوص یا رواداری کی ضرورت ہوتی ہے اس کے متحمل نہیں ہوتے ہم "گفتم وشد" چاہتے ہیں "کردم وشد" کی زحمتوں سے بچنا چاہتے ہیں۔ ہم مختلف الخیال لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر نہ عقل کی باتیں کرتے ہیں اور نہ خلوص کا ثبوت دیتے ہیں۔ دوسروں کی بات سننے اور اپنی بات منوانے میں جس تحمل، جس وسعت نظر اور جس فکر و تدبر کی ضرورت ہوتی ہے ہم ان سے چھپاتے ہیں، ہم میں بہت کم لوگ ایسے ہیں جو کمیٹی میں بیٹھ کر صحیح دلائل سے دوسروں کو قائل کر سکتے ہوں۔ ہم اپنے نقطہ خیال کو نقد و تبصرہ کی کسوٹی پر پرکھنے سے گھبراتے ہیں۔ ممکن ہے اس کا سبب یہ ہو کہ اپنے حقوق کی حفاظت کرنے کے لیے جس محنت و اعتماد کی ضرورت ہوتی ہے وہ ہم میں نہ ہو۔ بُرا کہنے سے بھلا بننا زیادہ مشکل ہے۔ یاد رکھئے دنیا کچھ ہی کیوں نہ ہو جائے اختلافات سہنے اور سلجھانے پڑیں گے۔ مجھ سے خفا نہ ہو جیے اقبال کو دعا دیجئے۔ جس نے کچھ سمجھ کر ہی کہا ہوگا ؎

تری دعا ہے کہ ہو میری آرزو پوری
میری دعا کہ تری آرزو بدل جائے

سیّد امتیاز علی تاج

تاج صاحب کا شمار اُردو کے اچھے ادیبوں میں ہوتا ہے۔ اور اُردو ڈرامہ نگاروں میں ان کو ایک امتیازی مرتبہ حاصل ہے۔ تاج صاحب کا وطن پنجاب ہے اور ان کی علمی و ادبی سرگرمیوں کا مرکز لاہور رہا ہے۔ جہاں آپ نے متعدد معیاری رسالوں کی ادارت کے فرائض بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیے۔

ڈرامہ نثر نگاری کی ایک ایسی صنف ہے جس میں کم و بیش جملہ اصناف کا رنگ جھلکتا ہے۔ اس کا دارومدار مکالمہ پر ہوتا ہے۔ اس میں کہانی کو مختلف کرداروں کی زبانی ادا کیا جاتا ہے۔

یوں تو اُردو ڈرامہ نگاری کی عمر زیادہ نہیں ہے۔ اس میں بھی جو ڈرامے لکھے گئے ان میں ادبیت کا فقدان ہے۔ آغا حشر کاشمیری، ابراہیم محشر اور رحمت علی وغیرہ نے متعدد اچھے ڈرامے لکھے۔ لیکن ان میں تجارتی مفاد کو مقدم اور ادبیت کو مؤخر رکھا گیا۔ معیاری ڈراموں میں تاج کا ڈرامہ "انارکلی" بہت مشہور ہے۔ یہ ایک بہترین رومانی ڈرامہ ہے۔ جس میں ایسی بیشتر خوبیاں موجود ہیں جو اچھے ڈرامہ میں ہونا ضروری ہیں۔ اس ڈرامہ کا پس منظر عہد اکبری کے بعض تاریخی واقعات سے وابستہ ہے۔ تاہم اس کی تاریخی حیثیت غیر مستند ہے لیکن ادبی درجہ مسلّم ہے۔ یہاں ہم اس ڈرامہ کا ایک منظر پیش کر رہے ہیں جس سے تاج صاحب کے زورِ قلم کا اندازہ کرنا آسان ہوگا۔

"انارکلی" کا ایک منظر

قلعہ لاہور میں سفید پتھر سے بنا ہوا ایک بلند مگر نہایت سادہ اور دل کشا ایوان جسے دیکھنے سے دماغ پر ایک فرحت افزا خاموشی اور خنکی کا اثر ہوتا ہے۔ اکبر۔ ایک مسند پر آنکھیں بند کیے اور پیشانی پر ہاتھ الٹا رکھے چپ چاپ لیٹا ہے معلوم ہوتا ہے سخت ذہنی محنت کے بعد اس کا دماغ تھک گیا ہے اور وہ اب بالکل خالی الذہن ہو کر اپنے مضمحل اعصاب کو آرام پہونچانا چاہتا ہے۔

مہارانی پاس بیٹھی ہے سامنے کنیزیں رقص کر رہی ہیں مہارانی ٹھوڑی ہاتھ پر رکھے کچھ سوچ رہی ہے۔ اکبر ایک دو مرتبہ آنکھیں کھول کر یوں کنیزوں کی طرف دیکھتا ہے۔ گویا ان کا رقص اسے تکلیف پہونچا رہا ہے۔ آخر ہاتھ اٹھاتا ہے اور کنیزیں جہاں ہیں وہیں ساکت ہو جاتی ہیں۔ ....

مہارانی:۔ (خاموشی سے چونک کر اکبر کو دیکھتی ہے) — مہاراج؟

اکبر:۔ (منہ موڑتے ہوئے کنیزوں سے) جاؤ۔

(کنیزیں رخصت ہو جاتی ہیں)

مہارانی:۔ کیوں! مہابلی؟

اکبر:۔ (آنکھیں بند کیے ہوئے) راحت نہیں۔ ان کے رقص کے قدم میرے تھکے ہوئے دماغ کو صدمہ پہونچاتے ہیں۔

مہارانی:۔ پھر اتنی محنت کیوں کیا کرتے ہیں مہاراج؟

اکبر:۔ (آنکھیں کھول کر چپ چاپ پڑا کچھ دیر سامنے تکتا رہتا ہے۔ اور پھر سکون سے) شہنشاہ ہوں رانی....

مہارانی:۔ اور پھر بھی؟

اکبر:۔ (پُر معنی انداز میں) کس کا قیاس جرأت کر سکتا ہے۔ کیا چاہتا ہوں۔

مہارانی:۔ سیوک جو موجود ہیں۔

اکبر:۔ (طنز کے خفیف تبسم سے) سیوکوں نے کتنے بادشاہوں کو اکبر اعظم بنا دیا؟

مہارانی:۔ نورتن اتنے بے حقیقت ہیں؟

اکبر:۔ (سکون سے) اگر اُن کو اکبر کے خواب ہدایت نہ دیں۔

مہارانی:۔ خواب؟

اکبر:۔ (خواب ناک نظروں سے سامنے کہیں دُور تکتے ہوئے) میری فوجیں، میری ریاست، میرے نورتن، میرے خوابوں کے پیچھے آوارہ ہیں۔ کون میری طرح ناممکن کے خواب دیکھ سکتا ہے؟ کون میری طرح اپنے خوابوں کو حقیقت سمجھ سکتا ہے........ میری عظمت میرے خواب ہیں رانی.....!

مہارانی:۔ آپ کی عظمت؟

اکبر:۔ اور ابھی تک .... ہندوستان ایک مسکین

کتے کی طرح میرے تلوے چاٹ رہا ہے ...... مگر ابھی تک
میری زندگی کا سب سے بڑا خواب اَن دیکھا پڑا ہے اور میں اسے
جنم دینے کا عزم اپنے میں نہیں پاتا۔

مہارانی :۔ خواب کا جنم ؟ کیا کہہ رہے ہیں مہابلی ؟

اکبر :۔ انسان کے جنم سے بہت زیادہ عزم چاہتا ہے۔ رانی ــــ
اور میں تھک گیا ہوں۔ اور اکیلا ہوں .... شیخو ....
کاش شیخو ــــ

مہارانی :۔ (اکبر کا منہ تکتے ہوئے) شیخو ؟

اکبر :۔ اپنے اجداد سے مختلف نہ ہو۔ تورانی ...... مغل ......

مہارانی : مغل کیا ؟

اکبر :۔ (آہستہ سے) لیکن ابھی کون جانتا ہے۔ کون کہہ سکتا ہے۔
(کسی قدر بیتاب ہوکر) مغلوں میں کوئی خواب دیکھنے والا نہ تھا۔ انھیں اکبر
مل گیا۔ اگر اکبر کے جانشینوں میں تیمور کی طوفانی روح، بابر کی حیرت انگیز
معلومات، اور ہمایوں کا آہنی استقلال ہوا .... (آہستہ سے)
لیکن ابھی کون جانتا ہے شیخو .... (کڑک کر) ہا ! زمین سر پٹخ، پٹخ
کر رہ جائے۔ اور قرن اور صدیاں اس کے سینے سے مغل علم کو نہ اکھاڑ سکیں

مہارانی (مناسب جواب کی کوشش میں) شیخو آپ کا موزوں
جانشین ہوگا۔

اکبر :۔ (گرم ہوکر) اگر اس کا یقین ہو جاتا تو میں اپنے دماغ کا

آخری ذرّہ تک خواب میں تبدیل کر دیتا۔ لیکن میری تمام اُمیدوں سے وہ اتنا بے اعتنا ہے۔ اتنا بے نیاز ہے کہ میں ...... لیکن میرا سب کچھ وہی ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ مجھے کتنا عزیز ہے کاش وہ میرے خوابوں کو سمجھے، ان پر ایمان لے آئے، اسے معلوم ہو جائے کہ اس کے فکرمند باپ نے اس کی ذات سے کیا ارمان وابستہ کر رکھے ہیں۔ وہ اپنی موت کے بعد اس میں زندہ رہنے کا کتنا مشتاق ہے ...... (سوچتے ہوئے) لیکن ابھی کیا معلوم۔

مہارانی:۔ ابھی بچّہ ہی تو ہے۔

اکبر:۔ (فہمائش آمیز متانت سے) ہماری محبت دیوانی نہیں کہ اس کا سن وسال بھول جائے اور ہم چاہتے ہیں تم بھی لے یقین دلاؤ کہ فی الحال وہ ایک بے پرواہ نوجوان کے سوا کچھ بھی نہیں۔

مہارانی:۔ مگر وہ اپنے ہم عمروں سے کچھ مختلف تو نہیں ہے۔

اکبر:۔ (کسی قدر برافروختہ ہو کر) یہ تم مجھ سے کہہ رہی ہو؟ اکبر سے؟ جو اس عمر میں ایک سلطنت کا بوجھ اپنے کمسن کندھوں پر اُٹھا چکا تھا جس نے دنیا کی بے باک نظروں کو جھکنا سکھا دیا تھا۔ جو اس عمر میں مفتوح ہند کو متحد کرنے کے دشوار مسائل میں منہمک تھا۔ ہاں جو اس عمر میں خواب تک دیکھتا تھا (اُٹھ کھڑا ہوتا ہے) تم ماں ہو صرف ماں (جانا چاہتا ہے)۔

مہارانی:۔ آپ بہت تھک چکے ہیں ابھی آرام فرمائیے۔

اکبر:۔ کوئی رقص لاؤ۔ کوئی موسیقی، نرم، نازک، خوش آیند، (بیٹھ جاتا ہے) انارکلی کہاں ہے؟ اس کو بلاؤ وہ تھکے ہوئے دماغ کو ٹھنڈک پہونچانا جانتی ہے…

مہارانی:۔ انارکلی بیمار ہے۔ مہاراج۔ اور اس کی ماں چاہتی ہے۔ آپ کی اجازت ہو تو اسے تھوڑے عرصہ کو تبدیل آب و ہوا کے لیے کسی دوسرے شہر بھیج دیا جائے۔

اکبر:۔ (نیم دراز ہوتے ہوئے) حکیم نے اُسے دیکھا؟

مہارانی:۔ کچھ تشخیص نہ کرسکا۔ لیکن خود انارکلی سمجھتی ہے آب و ہوا کی تبدیلی اُس کے لیے مفید ہوگی۔

اکبر:۔ (بے پرواہی سے) تم کو اعتراض نہیں۔ تو اُس کو اجازت ہے۔

مہارانی:۔ لیکن حرم سرا کے جشن میں تھوڑے سے دن رہ گئے ہیں۔ اور انارکلی کے بنا جشن سُونا رہ جائے گا۔

اکبر:۔ (کروٹ لیتے ہوئے) پھر مت جانے دو۔

مہارانی: دبا دُڈا لنا اچھا نہیں معلوم ہوتا۔

اکبر:۔ زبردستی کیوں ظاہر ہو۔ جشن تک اس کو علاج کے بہانے سے ٹھہرا لیا جائے اور جشن میں شامل کرنے کے بعد رخصت دی جائے۔

مہارانی:۔ لیکن وہ جشن کا اہتمام کیسے کرسکے گی؟

اکبر:۔ صرف رقص و سرود…….. انتظام کسی دوسرے

کے سپرد ہو۔

مہارانی :۔ دلآرام!

اکبر :۔ ہاں کہاں ہے اُس کو بلاؤ۔ اُس کا گیت ہمارے دماغ کو تر و تازگی بخشے گا۔

(رانی تالی بجاتی ہے)

(ایک خواجہ سرا حاضر ہو کر دست بستہ کھڑا ہو جاتا ہے)

مہارانی :۔ دلآرام!

(خواجہ سرا رخصت ہو جاتا ہے)

جشن کے متعلق کوئی ہدایت؟

اکبر :۔ (کسی قدر چڑھ کر) ہمارا نورتن کو ہدایت دینا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

مہارانی :۔ جشن میں شطرنج کھیلیں گے آپ؟

اکبر :۔ کون کھیلے گا ہم سے؟

مہارانی :۔ میں سلیم سے کہوں گی۔

اکبر :۔ اور اگر وہ جیت گیا۔ تو ہم کو خوشی ہو گی۔

(دلآرام حاضر ہو کر مجرا بجالاتی ہے)

مہارانی :۔ دلآرام! حرم سرا کے جشن کا اہتمام انارکلی کے بجائے تجھے کرنا ہو گا۔

دلآرام :۔ بسر و چشم۔

مہارانی: - اور انارکلی، صرف رقص و سرود ہی کے لیے شریک ہو گی۔

دلآرام: - بہت بہتر۔

مہارانی: - تو جانتی ہے۔ جشن کے لیے کیا کچھ کرنا ہوگا؟

دلآرام: - حضور میں پہلے کئی جشنوں کا اہتمام کر چکی ہوں۔

مہارانی: - اور دیکھ ظہا بلی سلیم سے شطرنج کھیلیں گے۔

دلآرام: - (کسی قدر چونک کر) صاحب عالم سے!

مہارانی: - ہاں!

(دلآرام کے دماغ میں سلیم اور انارکلی کے خیالات اس قدر گھومتے رہے ہیں کہ وہ سُن کر سوچ میں کھوئی سی جاتی ہے)

جشن شیش محل میں ہوگا۔ اور روشنی ـــــ تو سُن رہی ہے؟

دلآرام: - (چونک کر) صاحب عالم!

مہارانی: - بیگی۔ کیا صاحب عالم!

(اکبر آنکھ کھول کر دلآرام کی طرف دیکھتا ہے)

دلآرام: - صاحب عالم علیل تھے مہارانی۔

اکبر: - نہیں وہ شریک ہوگا۔

مہارانی: - سُنا۔ جشن شیش محل میں ہوگا۔ اور روشنی.......

اکبر: - اب بس۔ پہلے کوئی گیت، سیدھا سادا۔ اور میٹھا۔ مگر آواز دھیمی اور نرم۔ گرم اور زخمی دماغ کو ایک ٹھنڈا مرہم چاہیے۔ رقص

ہلکا، پھلکا، گھنگھروؤں کا شور نہ ہو، بہت چکّر نہ ہوں۔ پاؤں آہستہ، آہستہ زمین پر پڑیں، جیسے پھول برس رہے ہیں۔ برف کے گالے زمین پر اُتر رہے ہیں۔ لیکن خمار نہ ہو۔ نیند نہ آئے۔ ہمیں پھر مصروف ہونا ہے۔

(دلآرام رقص شروع کرتی ہے۔ مگر رقص کے دوران میں بھی وہ سُوچ میں ہے۔ اور ذہنی مصروفیت کے باعث اُس کے رقص میں نقص نظر آ رہے ہیں)۔

اکبر:۔ (اُٹھ کھڑا ہوتا ہے) کچھ نہیں۔ کسی کو نہیں آتا، کوئی نہیں جانتا ــــ اور انارکلی علیل ہے۔

(اکبر اور پیچھے پیچھے مہارانی جاتی ہے)

دلآرام:۔ (جیسے سُوچ میں سن کھڑی رہ جاتی ہے)

انارکلی ہوگی...... سلیم ہوگا .... اور اکبر بھی......... کاش اگر اکبر دیکھ سکتا...... کاش اگر میں اکبر کو اس کی آنکھوں سے دکھا سکتی....... آہ...... پر یہ ضرور ہوگا۔ اور جشن ہی کے روز......... دو ستارے......... وہی دو ستارے......... ...... مگر ایک دہکتا اور جگمگاتا ہوا......... اور دوسرا ٹوٹ کر بجھا ہوا......... ...اور کون جانے! ....

آہستہ سے زمین پر بیٹھ جاتی ہے۔ اور سر جھکا کر ایک گہری سوچ میں کھوئی جاتی ہے)

پردہ

علی عبّاس حسینی

آپ کا وطن بارہ ضلع غازی پور ہے وہیں فروری ۱۸۹۶ء میں پیدا ہوئے
ملک السادات سید مسعود غازی حسینی الترمذی کی اولاد سے ہیں۔ ابتدا میں فارسی
و عربی کی تعلیم مدرسہ سلیمانیہ پٹنہ میں حاصل کی، پھر انگریزی کی طرف متوجہ ہوئے
۱۹۱۹ء میں کیننگ کالج لکھنؤ سے بی۔ اے کیا۔ ۱۹۲۱ء میں ایل، ٹی اور ۱۹۲۲ء
میں تاریخ میں ایم۔ اے کیا۔ ۱۹۲۲ء سے محکمۂ تعلیمات میں ملازمت کی۔ ان
دنوں حسین آباد گورنمنٹ ہائر سکنڈری اسکول لکھنؤ کے پرنسپل ہیں۔

حسینی صاحب کو بچپن ہی سے قصوں کہانیوں سے بہت شوق تھا۔ آپ
نے سب سے پہلی کہانی ۱۹۱۶ء میں لکھی جو رسالہ "زمانہ" کانپور میں "پژمردہ کلیاں"
کے نام سے شائع ہوئی۔

اس وقت تک کہانیوں کے پانچ مجموعے "رفیقِ تنہائی" "باسی پھول"
"آئی سی۔ ایس" "کچھ ہنسی نہیں" اور ایک ایکٹ کے نو ڈراموں کا مجموعہ
"نورتن" دو ناول "سر سید احمد پاشا" اور "شاید کہ بہار آئی" اور ایک تنقیدی
کتاب "ناول کی تاریخ و تنقید" زیورِ طبع سے آراستہ ہو چکے ہیں۔ ہندوستانی
اکاڈمی یو۔ پی نے "رفیقِ تنہائی" کو ۱۹۳۲ء کی سب سے بہتر تصنیف تسلیم کر کے
حسینی صاحب کو پانچ سو روپیہ کا گرانقدر انعام عطا فرمایا۔

حسینی صاحب پریم چند کی طرح دیہاتی زندگی سے خاص دلچسپی رکھتے ہیں، ان کا
مطالعہ فطرتِ انسانی کے متعلق گہرا ہے۔ وہ ہلکے پھلکے جملوں میں بڑی اہم اور قابلِ قدر
باتیں کہہ جاتے ہیں۔ چونکہ ان کا مطالعۂ ادب بہت وسیع ہے اس لیے ان کی تحریروں
میں بڑے بڑے ادبی نکات کی طرف بڑے لطیف اشارے ملتے ہیں۔ انکے مزاج میں
ہلکی سی ظرافت بھی ہے۔ جس سے ان کی تحریر میں خشکی نہیں پیدا ہونے پاتی۔

حسینی صاحب کا شمار اردو کے مختصر افسانہ نویسوں کی صفِ اول میں ہوتا ہے

آپ کا طرزِ تحریر شگفتہ و دلکش ہے۔ زبان سلیس و بامحاورہ استعمال کرتے ہیں۔ آپ کے مختصر مگر دلچسپ ڈرامے اردو ادب میں قابلِ قدر اضافہ ہیں۔

"مانجھی"

دریا طغیانی پر تھا۔ دونوں ساحل میلوں تہ آب تھے۔ ہر موج غرّا کر اٹھتی اور دُور تک فرشِ آب کو الٹتی پلٹتی چلی جاتی۔ ہر لہر اس زور سے کنارے سے آ کر ٹکراتی کہ دریا کے قریب کی زمین ہلتی محسوس ہوتی۔ کبھی کبھی ایسے بڑے بڑے گرداب پڑتے کہ معلوم ہوتا پورے پورے جزیرے غرقاب ہو جائیں گے۔ کبھی کبھی ایسا دھماکہ ہوتا جیسے اندر ہی اندر کوئی آتش فشاں پہاڑ پھٹ گیا۔ خود ساحل پر نہ جانے کیا کیا دریا نے لا کر پھینک دیا تھا، مری ہوئی مچھلیاں، نیم جان کچھوے، سیپ گھونگھے، سڑی ہوئی لاشیں، الٹی ہوئی بڈیاں، ٹوٹے ہوئے گھڑے۔ پانی ان کو کبھی شوق میں بڑھ کر اپنی آغوش میں سمیٹ لیتا، کبھی خفا ہو کر اتری ہوئی پاپوش کی طرح اچھال کر دُور پھینک دیتا۔

اس پر پچھم سے بادل اٹھے۔ دہ ہکتی گرجتے ہوئے بل کھاتے ہوئے اور چند ہی منٹ میں پوری فضا پر چھا گئے۔ شام کا زرد رُو آفتاب ڈر کر چھپ گیا۔ تاریکی نے سیاہ چادر پھیلا کر ہر چیز کو ڈھک دیا اور بڑی سخت کڑک کے ساتھ آسمان پھٹا اور موسلا دھار مینھ گرنے لگا۔ ہوا نے بوندوں کے تیر اس کثرت سے دریا کے سینے پر مارے کہ وہ کرب و غصہ سے اور بھی تلملا اٹھا اور اس کی درد بھری چیخ اور اس کی جھلاہٹ بھری چنگھاڑ سے سب کے دل لرزنے لگے۔

ایسے ہولناک موسم میں بوڑھے مانجھی نے کنارے پر لگی ہوئی اپنی چھوٹی کشتی کھولی۔ لوگوں نے اچنبھے سے دیکھا یہ بوڑھا کیا کرنے والا ہے، مگر جب وہ کشتی کو ریت سے ڈھکیل کر پانی میں لے آیا تو کئی چیخ پڑے۔ "کیوں جان دے رہا ہے بوڑھے! کیا ہم سب کے سامنے ڈوب مرنے کا ارادہ ہے؟"

مانجھی نے مسکرا کر دوسرے ساحل کی طرف اشارہ کر دیا۔ وہاں چاندی کا ایک محل تھا۔ اس اندھیرے میں بھی چمکتا ہوا، ایسا سفید کہ آنکھ نہ ٹھہرتی۔ محسوس ہوتا چاندی میں پارہ ملا کر کسی مخصوص سانچے میں دیوتاؤں کے لئے ڈھالا ہے اور تیاری پر دودھ میں نہلا کر اسے یہاں لا کھڑا کر دیا ہے۔ اور اس کی بیچ والی محراب میں ایک دیوی کھڑی ہے۔ بقعۂ نور! اور اس میں اس بلا کی کشش ہے کہ جہاں ایک بار نظر پڑی پھر درشن کیے بغیر چین ناممکن ہے۔

مانجھی کے اس اشارے نے جادو کا کام کیا۔ جتنے پاس کھڑے تھے وہ سب گرتے پڑتے، پھسلتے لڑھکتے، گھٹنے گھٹنے پانی میں اتر کر کشتی میں آ کر بیٹھ گئے۔ بلکہ مجمع اتنا بڑھا کہ دس پانچ ڈونگیاں اور ساتھ ہو گئیں۔ مانجھی کے اشارے پر سب ایک ساتھ اس طرح باندھ دی گئیں کہ تخت رواں کی صورت پیدا ہو گئی۔

مسافروں میں سے نہ کسی کے پاس چھتری، نہ کسی کے جسم پر برساتی، سب یوں ہی بھیگے، کیچڑ میں آئے بیٹھے رہے۔ اور اس یقین کے باوجود کہ چاندی کے محل تک پہونچنا محال ہے اور دیوی کے درشن کی آرزو موت کے گھاٹ اتارے گی، کشتی میں ڈٹے بیٹھے رہے۔ ہاں جب کبھی وہ سردی یا خطرے سے کانپ اٹھتے نظریں اٹھا کر اپنے مانجھی کو دیکھ لیتے۔

بڑا وقار تھا بوڑھے مانجھی کے چہرے پر۔ سوکھا سا سانولہ آدمی ننگے بدن کی ہڈیاں پسلیاں گن لیجیے۔ چہرہ کا کٹ بھی خوبصورت نہیں، نہ ہاتھ پاؤں ہی ڈھنگ کے جسم میں سوائے ایک گھٹنوں سے اونچی لنگی کے کوئی کپڑا نہیں، لیکن جہاں اس کی آنکھوں سے آنکھیں ملیں اور معلوم ہوا معصوم چاندنی آہستہ آہستہ دل میں اتر تی جاتی ہے اور اس طرح کا اطمینان اور اس طرح کا یقین پیدا ہوتا جاتا ہے جیسے نہ تو اب کسی خطرے کا ڈر ہے، نہ کسی چیز کی دل میں خواہش، بس اگر کوئی لگن ہے تو اتنی کہ یہ جو کچھ کہے وہ کیا جائے، یہ جو راستہ دکھائے اسی پر چلا جائے۔ اور یہ جس رخ پر چاہے بہا تا لے جائے۔ دنیا کی راحتیں اتنے ہی میں ملتی تھیں کہ اس کی مرضی پر اپنے کو چھوڑ دیا جائے۔ لوگ حیرت سے اس کے استقلال کو، اس کے عزم کو دیکھ رہے تھے۔ ایسا طوفان، یہ ہوا اور دھارے کا یہ تیز بہاؤ، پھر اس پر بڑھتی ہوئی تاریکی، قدم قدم پر بھنور، چپہ چپہ پر مگر مچھ، گھڑیال، اور راستے میں روکنے، ٹوکنے، ڈبونے والے دشمن کے جہاز اور یہ اکیلا بوڑھا مانجھی، اس کے کمزور ہاتھ پاؤں، اس کی چھوٹی سی کشتی، مگر اس کے یہاں ڈر کا احساس ہی نہ تھا، اسے اپنی فتح کا یقین کامل تھا۔ اس طرح کا یقین کہ وہ دوسروں میں بھی تیزاب کی طرح سرایت کرتا جاتا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ اگر یہ کہتا ہے کہ یہ ہمیں چاندی کے مندر تک لے جائے گا، یہ ہمیں دیوی کے درشن کرا دے گا، تو ایسا ہی ہو کر رہے گا۔

اسی لیے لوگ کبھی جھلملا جھلملا کر چمکنے والے مندر کو دیکھتے اور کبھی اس بوڑھے مانجھی کو۔

مانجھی نے کمر سے اوپر تک پانی میں اتر کر کشتی کو آہستہ آہستہ دھارے کے

خلاف موڑا۔ مگر جیسے ہی وہ خود کشتی پر چڑھا پانی کے ایک تھپیڑے نے ناؤ بھر دھارے پر موڑ دی۔ وہ اس طرح ڈگمگانے لگی کہ بیٹھنے والے بے ساختہ چیخ اُٹھے۔

مانجھی نے ان لوگوں پر اطمینان دلانے والی نظر ڈالی اور ڈنڈا اُٹھا کر بڑی سہولت سے کشتی بھر دھارے کے خلاف موڑی۔ کشتی چلی، تھپیڑوں سے کھیلتی، موجوں سے لڑتی، گردابوں کو جھیلتی چلی، پانی رک گیا، ہوا کی تیزی کم ہوگئی۔ موجوں کی بلندی پست ہوگئی، مگر تاریکی بڑھ گئی، ہولناکی بڑھ گئی، گھڑیالوں کا تاک میں لگا ہوا گروہ بڑھ گیا۔

کنارے سے سَو گز کی دُوری پر اُن میں سے ایک اُچھلا، ایک چیخ پیدا ہوئی اور ساتھ کی کشتیوں میں سے ایک مسافر گم ہوگیا۔ ساتھیوں نے خوف سے کانپ کر مانجھی کے قریب سمٹنا شروع کیا۔ وہ بالکل اس طرح سمٹ رہے تھے جس طرح چوزے چیل کے جھپٹنے پر ماں کے پروں میں چھپنے کی کوشش کرتے ہیں۔

مانجھی مسکرایا۔ "ڈرو نہیں، دیوی کے درشن کے لیے ایسی کتنی قربانیاں دینا پڑیں گی۔" وہ اپنا اپنا زیادہ اور کم ڈر چھپا کر خاموش بیٹھ گئے۔ مگر ویسے ہی پاس سے دھارے پر بہتی گیس کی لالٹین جلائے ہوئے ایک بڑی کشتی گزری اور اس پر بیٹھنے والوں نے انھیں بُلایا۔

ساتھ کی کشتیوں میں سے کئی مسافر اچک اچک کر اُس پر ہو لیے بیٹھے ہوئے مُسافروں نے اُنھیں "بزدل! بودا! غدّار" نہ جانے کیا کیا کہا۔ لیکن مانجھی کے چہرے پر شکن نہ آئی۔ وہ ڈنڈا چلائے گیا۔ گھڑیال اُچھلتے گئے۔ موجوں کے پہاڑ آ آ کر کشتی کو کن جن جنگالے جاتے بھر پاتال میں ٹپکتے رہے۔ بڑی بڑی

بھنوریں ناؤ کو لٹو کی طرح نچاتی رہیں۔ بدحواس گرتے رہے، بزدل چیخ چیخ کر اپنے کو بچانے کی کوشش کرتے رہے، لیکن مانجھی کی ناؤ چلتی رہی، ڈگمگاتی ہچکولے کھاتی، لہروں پر چڑھتی اترتی چلتی رہی۔

ایک بڑا سا لائف بوٹ آیا اس پر کئی ہنڈے جل رہے تھے اس پر ایک شامیانہ لگا ہوا تھا۔ اس کے نیچے مسند تھی، گاؤ تھے، کچھ لوگ بڑی شان سے اُن پر بیٹھے تھے، پیچوانیں منہ میں، خاصدان سامنے اور ان کے بیچ میں ایک رقاصہ کولہے مٹکا مٹکا کر ناچ رہی تھی۔ پانی کے تلاطم میں اس کے پازیب کی چھم چھم، تبلے کی گمک اور سارنگی کی ریں ریں، بہت ہی دل کش معلوم ہوتی تھی۔ لائف بوٹ والوں نے اسے موڑ کر اس طرح راستے میں کر لیا کہ چھوٹی ڈونگی اس سے آکر ٹکرائی اور رک گئی۔ ان لوگوں نے مانجھی کے ساتھیوں کو ترغیب دی، دھمکایا، ڈرایا، اپنے بے خطر ہونے اور ان کے خطروں سے گھرے ہونے کا یقین دلایا اور دو چار کمزور دلوں کو اپنے ساتھ لے کر آگے بڑھ گئے۔

مانجھی نے کوئی روک ٹوک نہ کی۔ وہ مسکراتا رہا اور اپنی کشتی دھارے کے خلاف چلاتا رہا — اور وہ ڈگمگاتی، ہچکولے لیتی، پانی کے بڑے بڑے گھونٹ پیٹ میں اتارتی چلتی رہی، چلتی رہی ——

ایک بڑا سا اسٹیمر آیا جس کے بعض مسافر ٹوپ لگائے، بعض لال پگیا باندھے تھے۔ انھوں نے ڈانٹا، گھُڑکا، منع کیا کہ دھارے کے خلاف نہ چلا۔ لیکن مانجھی نے سُنی اَن سُنی کر دی۔ وہ کشتی چلاتا رہا، چلاتا رہا۔ ان میں سے ایک نے خفا ہو کر کہا "اسے باندھ لو" اور بڑی بڑی زنجیروں سے کشتی اسٹیمر سے باندھی گئی

اور وہ اسے کھینچتا ہوا چلا، دریا کے سینے پر گہری لکیر ڈالتا، تلاطم سے بے پروا، ہوا سے بے خطر ــــ لیکن مانجھی! وہ اب بھی اپنی کشتی کو دھارے کے خلاف چلاتا رہا، چلاتا رہا، یہاں تک کہ بڑا اسٹیمر سست ہو گیا، پھر اس طرح سے جھٹکے لے کر چلنے لگا جیسے کوئی چیز بار بار پہیے میں پھنستی ہو۔ پھر مطلق رک گیا، افسر نے جھلا کر کہا "کشتی کاٹ دو" اور زنجیریں ٹکڑے ٹکڑے ہو کر گر پڑیں اور مانجھی اپنی ڈونگی لے کر پھر چلا۔ متانت کے ساتھ، یقین کے ساتھ، دھارے کے خلاف، موڑ کے رُخ کے خلاف، ساتھیوں کی تعداد سے بے پروا، ڈرنے والوں، ڈرنے والوں کی چیخ اور ڈانٹ کی طرف سے کان بند کیے ہوئے ــــ

ایک اس سے بھی بڑا جہاز آتا دکھائی دیا۔ کشتی کے مسافر سمجھے اب کے یہ باندھ ہی نہ لے گا بلکہ کشتی ہی اُٹھا کر ڈک پر رکھ لے گا۔ انھوں نے گھبرا کر مانجھی کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرایا، اس کی آنکھوں میں خود اعتمادی جھلک کر چھلک گئی، اس طرح چھلک گئی کہ مٹھی بھر آدمیوں کا مجمع ایک نئی شراب سے چھک گیا۔ ان کو بھی خطرے میں مزہ آنے لگا، انھیں بھی رات کی تاریکی، بجلی کی کڑک اور دریا کے غرّوں میں لطف ملنے لگا، ایک سرور و کیف کا عالم ہر ایک پر چھا گیا۔

جہاز والے پاس سے گزرے مگر مسکراتے ہوئے۔ انھوں نے کچھ زبان سے نہ کہا لیکن ان کی ہنسی کہتی تھی، کوئی بھید ہے، جو چھپا یا جا رہا ہے، انھوں نے کشتی کو کسی نئی مصیبت میں پھنسانے کا خاموش انتظام کیا ہے، جب ہی وہ چُپ بھی ہیں اور مسکرا بھی رہے ہیں۔

مسافر گردنیں جھکائے بیٹھے تھے، مانجھی کی نظریں اُس پار والے
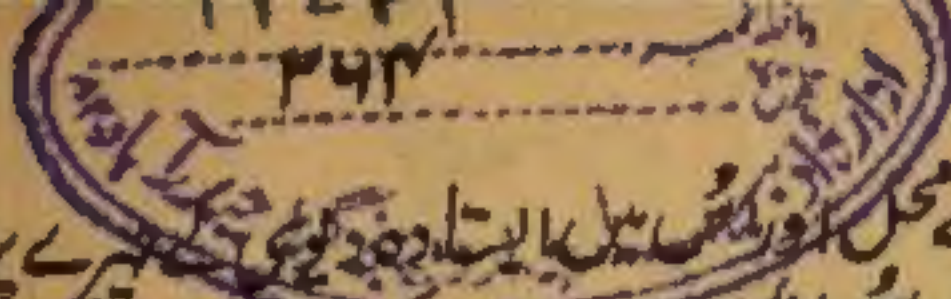
چاندی کے محل [illegible] کہرے پر جمی تھیں۔ اندھیـ
میں اور کچھ سجھائی بھی نہ دیتا تھا کہ دفعتاً نصف کشتی کسی چیز میں پھنس
پانی میں چلی گئی، مانجھی نے چونک کر اُدھر دیکھا، ساتھیوں سے پوچھا کہ
ان میں سے دو ایک پانی میں غوطے کھا رہے تھے، دو ایک خوف سے
چیخ رہے تھے، جواب کون دیتا۔ وہ آہستگی سے اپنی جگہ سے اٹھا، بیچ میں
جو مسافر دہشت سے کانپ رہے تھے، انھیں دلاسا دیتا اور مرد بنا
اُس سرے پر آیا جو غرقاب تھا۔ اُس نے ٹٹول کر دیکھا تو ایک فولاد
جال تھا جو اندر ہی اندر نہ جانے کتنی دُور تک بچھا تھا۔ وہ اُسی
پر پانی میں بیٹھ گیا۔ اور اس نے آہستہ آہستہ اس جال کو توڑنا شرو
کیا۔ جس جس طرح یہ جال ٹوٹتا جاتا تھا ویسے ویسے کشتی بلند ہوتی جا
تھی، بڑھتی جاتی تھی، ٹیڑھی ترچھی ہوتی ہوئی، ڈگمگاتی ہوئی
ہچکولے کھاتی ہوئی، پانی کے بڑے بڑے گھونٹ نگلتی ہوئی بڑھتی
ہی جاتی تھی، بلند ہی ہوتی جاتی تھی —— دفعتاً چھن سے آواز آ
جال دو ٹکڑے ہو گیا اور کشتی ایک بندھی ہوئی ڈونگی کا ساتھ چھوڑ
سیدھی ہو گئی، اُبھری اور لہروں پر تیزی سے چلنے لگی ——

سروں پر چہچہاتے طیور نے چتر پھیلایا، صبح کے دھندلکے میں
چاندی کے محل کی روشنی پھیلی، اور آفتاب کی پہلی کرن نے بڑھ کر
محراب میں کھڑی دیوی کے رخِ شہابی اور مانجھی کے سانولے چہرے
کو ایک سنہری رشتے میں باندھ دیا!

—— ✻ ——